پریم چند کے بہترین افسانے

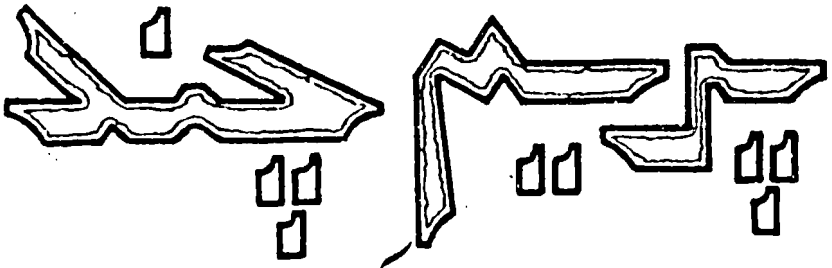

پریم چند

کے

بہترین افسانے

پریم چند

تحقیق و ترتیب : محمد طارق چودھری

چودھری اکیڈیمی۔ لاہور
الفضل مارکیٹ۔ ١٧۔ اردو بازار

ناشر : محمد خالد چودھری
اہتمام : چودھری محمد طارق
مطبع : شکر گنج پرنٹرز، لاہور
قیمت : ۱۰۰/- روپے

فہرست

مقدمہ ـــــــ ڈاکٹر قمر رئیس

۱	بڑے گھر کی بیٹی	۱۹۱۰ء	۲۵
۲	نمک کا داروغہ	۱۹۱۵ء	۳۶
۳	حج اکبر	۱۹۱۷ء	۴۷
۴	نوک جھونک	۱۹۲۰ء	۶۱
۵	بوڑھی کاکی	۱۹۲۰ء	۷۱
۶	شطرنج کی بازی	۱۹۲۴ء	۸۲
۷	سجان بھگت	۱۹۲۷ء	۹۶
۸	پوس کی رات	۱۹۳۰ء	۱۱۰
۹	طلوع محبت	۱۹۳۱ء	۱۱۹

۱۰	نجات	۱۹۳۱ء	۱۳۳
۱۱	دو بیل	۱۹۳۱ء	۱۴۲
۱۲	شکوہ و شکایت	۱۹۳۲ء	۱۵۸
۱۳	زیور کا ڈبہ	۱۹۳۲ء	۱۷۳
۱۴	مس پدما	۱۹۳۲ء	۱۹۰
۱۵	نئی بیوی	۱۹۳۲ء	۲۰۶
۱۶	کفن	۱۹۳۵ء	۲۲۴
۱۷	دو بہنیں	۱۹۳۶ء	۲۳۴

مقدمہ

ڈاکٹر قمر رئیس

گذشتہ نصف صدی میں اردو کے افسانوی ادب نے تعمیر و ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں اور یہ پیش رفت بڑی تیز رفتار، کثیر الجہت اور پہلو دار رہی ہے۔ اس لئے کہ دوسری جنگ عظیم اور پھر آزادی کے بعد ملک کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات میں بڑی نتیجہ خیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان کے اثر سے انسانی رشتے اور سماجی رویے بھی بدلے۔ تقسیم، فسادات، ہجرت، خاتمۂ زمینداری، صنعتوں کا فروغ، زرعی ترقیاں، مزدوروں کی تحریکیں، تعلیم کی توسیع، ہمسایوں سے جنگیں، ہر بحرانوں اور اقلیتوں کے ساتھ بے انصافیاں، فسادات، عدم تحفظ، بے روزگاری، بڑھتی ہوئی گرانی اور ایسے ہی دوسرے قومی مسائل نے عام انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس عہد کے اردو افسانے میں اس صورت حال سے پیدا شدہ سماجی کیفیات اور انسانی نفسیات کی پیش کش کے لئے اظہار و اسلوب اور تکنیک کے نو بہ نو تجربے کئے گئے۔ نئی سماجی حقیقتوں کے ادراک اور اظہار نے افسانہ میں نئے رجحانات کو جنم دیا اور ان کی پرورش کے لئے راہیں ہموار کیں۔ مغرب کے افسانوی ادب میں جو رجحانات اور تجربات جگہ بنا چکے تھے اردو افسانہ ان سے بھی متاثر ہوا، پلاٹ کی اہمیت کم ہوگئی۔ افسانہ کے مسلمہ اور مروجہ فنی عناصر کو برتنے سے گریز کیا جانے لگا۔ مناظر فطرت اور خارجی سماجی مظاہر کی تفصیلی

تصویر کشی سے دلچسپی کم ہوتی گئی۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی داخلی زندگی کی تفسیر و ترجمانی کا رجحان بڑھتا گیا۔ عشق و محبت، خوب و زشت اور انسان دوستی کے تصورات بھی بدلے۔ اظہار و اسلوب میں بھی نئے پیرائے اپنائے گئے اور بعض افسانہ نگاروں نے بیانیہ اور حقیقت پسندانہ تکنیک کے بجائے داخلی اور علامتی اظہار پر زور دیا۔ ہر نئے تجربے کی طرح یہ سارے تجربات بھی بڑے انوکھے اور پرکشش معلوم ہوئے اور نوجوان لکھنے والوں میں وہ ادبی فیشن کی طرح برتے جانے لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد گوناگوں تجربات کے اس عمل میں قرۃ العین حیدر کے علاوہ کسی فن کار کو ایسا کمال اور استحکام حاصل نہ ہوا جو قارئین کے ہر حلقہ میں مقبول ہو کر روایت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے بھی 'آخر شب کے ہم سفر' اور 'ہاؤسنگ سوسائٹی' اور 'دلربا' جیسے ناولٹ لکھ کر حقیقت نگاری کی اس عظیم روایت سے اپنا رشتہ جوڑا جسے پریم چند نے ایک خاص منزل تک پہنچایا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں نے نہ صرف اس روایت کی آبیاری کی بلکہ تخلیقی اظہار کی نت نئی جہتوں میں اس کے امکانات کو دریافت کیا۔ اجتماعی زندگی کی آویزشوں اور نفسیاتی حقیقتوں کو فنی اظہار کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بن کر آزادی کے بعد جن ادیبوں نے اس روایت کو حیات نو بخشی ان میں بلونت سنگھ، رام لعل، جیلانی بانو، جوگندر پال، قاضی عبدالستار، رضیہ سجاد ظہیر، رتن سنگھ، اقبال متین، اقبال مجید، آمنہ ابوالحسن اور عابد سہیل کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پریم چند کی روایت اردو کے افسانوی ادب میں بنیادی روایت کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے افسانے اردو افسانے کے سفر کی ہر منزل میں چراغوں کی طرح روشن رہے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں آزادی سے قبل کی زندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ ان کے کمال فن کا اصل راز یہی تھا کہ انھوں نے اپنے عہد کی روح کو، اپنی قوم کے دھڑکتے دل کو اور ایک آزاد اور خوش حال سماج کے لئے ہندوستانی عوام کی آرزوؤں اور ان کے ایثار و عمل کو تخلیقی حسن کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمو لیا تھا۔ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان اور ایک وطن پرست ادیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنے وجود کو افلاس، محرومیوں اور دکھوں کے مارے ہوئے

ہندوستان کے محنت کش انسانوں کی زندگی اور ان کے مقدر سے کامل طور پر ہم آہنگ کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے قارئین کو دور سے یا بلندی سے آواز نہیں دی بلکہ ان کے پاس آکر ان میں رد کر، ان کے دلوں میں جھانک کر ان کا اعتماد حاصل کیا۔ ان کے مسائل پر ان ہی کی زبان اور لہجہ میں گفتگو کی اور اس لئے انھوں نے جو بھی لکھا، ان کے قارئین بیک آواز کہہ اٹھے ــــ 'یہی ایک ادیب ہے جس نے ہمارے دکھوں کو محسوس کیا ہے۔ ہمیں ہماری روح کے سناٹوں میں آواز دی ہے، ہماری مصیبتوں میں شریک رہا ہے، جس نے ہمارے دل کی دھڑکنیں سنی ہیں۔ جو ہم میں سے ہے، ہمیں جانتا اور پہچانتا ہے۔ ہندوستانی عوام کے اسی اعتماد اور زندگی کے اسی عرفان نے پریم چند کو عظمت بخشی اور ان کی تصانیف اس ملک کی اعلیٰ قومی تہذیب کا حصہ بن گئیں۔

ایک مضمون میں پریم چند نے لکھا ہے۔

ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور روشنی پیدا کرے۔" پریم چند کے شاہکار افسانے بلاشبہ اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں

پریم چند اور مختصر افسانہ کا فن

ناول کی طرح اردو میں مختصر افسانہ کی صنف بھی مغرب کی دین ہے۔ مغرب میں ایک آزاد صنف ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے وسط میں اس کا رواج ہوا۔ اردو میں اگرچہ پریم چند سے پہلے مغربی افسانوں کے کچھ تراجم شایع ہوئے تھے اور چند طبع زاد افسانے بھی لکھے گئے لیکن جس ادیب نے سنجیدگی کے ساتھ اس صنف کو اپنے خیالات اور تخلیقی صلاحیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے رواج دیا وہ پریم چند ہی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' ۱۹۰۸ء میں شایع ہوا۔ ان کے افسانوں میں وطن پرستی اور آزادی کے پاکیزہ جذبات اور خیالات کو موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ان افسانوں نے فنی اسلوب، زبان اور تکنیک میں

مختصر افسانہ کے بجائے قدیم قصوں اور داستانوں کا رنگ غالب ہے۔ اظہار و بیان کا انداز بھی مرصع اور رنگین ہے۔ واقعیت پسندی اور تاثر کی وحدت جو افسانہ کی جان ہوتی ہے 'سوزِ وطن' کے افسانوں میں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے بعد پریم چند نے بڑے گھر کی بیٹی، بے غرض محسن اور کرشمہ انتقام جیسے افسانے لکھ کر اردو میں مختصر افسانہ کی فنی ساخت کا ایک واضح تصور پیش کیا۔ اور پھر ۱۹۳۶ء تک پیہم ریاضت سے اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ مختصر افسانہ کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے پریم چند ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی فطری مصوری کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے۔ اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تجربات ہی تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں لیکن یہ سمجھنا بھول ہوگی کہ کہانی زندگی کی حقیقی تصویر ہے حقیقی زندگی کی تصویر تو انسان خود ہو سکتا ہے۔ مگر قصے کے اشخاص کے خوشی و غم سے ہم جتنا متاثر ہوتے ہیں اتنا حقیقی زندگی سے نہیں ہوتے جب تک کہ وہ خود اپنی ذات سے متعلق نہ ہو۔ کہانیوں میں کرداروں سے ہمیں ایک ہی دو منٹ کے تعارف میں اپنائیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور ہم ان کے ساتھ ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔"

مضامین پریم چند

یہاں پریم چند نے افسانہ میں عام انسانی زندگی سے اخذ کئے ہوئے کرداروں کے مطالعہ اور ان کے نفسیاتی تجزیہ پر بڑا زور دیا ہے۔ فروری ۱۹۳۴ء میں ایڈیٹر نیرنگ خیال کے نام اپنے ایک خط میں بھی پریم چند نے افسانہ کے واقعاتی اور نفسیاتی عنصر کو خاص اہمیت دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرے قصے اکثر کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی

حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا.... کوئی واقعہ افسانہ نہیں تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔" (پریم چند کے خطوط ص ۳۰۱)

پریم چند نے ایک مضمون میں اس کی وضاحت بھی کی ہے کہ نفسیاتی حقیقت سے ان کی کیا مراد ہے؟

"اعلیٰ ترین مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جائے۔ نیک باپ کا نالائق اولاد کی زبوں حالی میں رنجیدہ ہونا ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ اس جذبہ میں باپ کی ذہنی ہیجانی کیفیات اور اس کے مطابق اس کے ردعمل کی مصوری بھی افسانہ کو موثر اور پرکشش بنا سکتی ہے۔ برا شخص بالکل ہی برا نہیں ہوتا۔ اس میں کہیں فرشتہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہے۔ اس پوشیدہ یا خوابیدہ فرشتہ کو ابھارنا اور اس کا سامنے لانا ایک کامیاب افسانہ نگار کا شیوہ ہے۔ پے در پے مشکلات پیش آنے پر انسان کتنا دلیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑے سے بڑے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشہ میں پوشیدہ جوہر نمایاں ہو جاتے ہیں اور ہمیں متعجب کر دیتے ہیں۔ یہ ایک انسانی حقیقت ہے۔"

(مضامین پریم چند ص ۱۸۴)

یہاں میں نے صرف تین مثالیں لی ہیں ورنہ پریم چند نے مضمون میں اور بھی کئی مثالیں دی ہیں۔ پریم چند نے اپنے مضامین اور خطوط میں کہیں بھی اس پر زور نہیں دیا کہ افسانہ میں سماجی، سیاسی یا اخلاقی مسائل پیش کئے جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کسی بھی فرد کی ذہنی اور جذباتی پیچیدگیاں اس کے سماجی رشتوں، سماجی کشیدگیوں اور سماجی آویزشوں ہی کا عکس ہوتی ہیں۔ ان سے الگ اور آزاد وہ اپنا وجود نہیں رکھتیں۔ سماجی واقعات

کے ردعمل میں ہی انسان اپنی انفرادیت کو جتاتا اور مستحکم بناتا ہے۔ وہ انسان کو اس کی کلیت کے آئینہ میں دیکھتے ہیں جو بے شمار سماجی اداروں، تہذیبی مظاہر، سیاسی حقیقتوں اور اخلاقی بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ بعض دوسرے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے کردار اگر عاشق ہیں تو بس عشق کئے جاتے ہیں، مصلح ہیں تو صرف اصلاح فرماتے ہیں، انقلابی ہیں تو انقلاب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ پریم چند کے کردار ہمہ جہتی ذہنی اور عملی سرگرمیوں میں ہی اپنے وجود کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پریم چند جانتے تھے کہ دستورِ فن کے مطابق قاری کی دلچسپی ان ذہنی اور جذباتی گتھیوں سے یا ان سماجی اور سیاسی مسائل سے نہیں ہوتی جن سے کردار الجھتے ہیں یا نبرد آزما ہوتے ہیں بلکہ اس کی دلچسپی کا اصل مرکز وہ کردار اور ان کے اصول و اقدار یا ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ سچائی پریم چند پر روشن تھی۔

اور ایسا اس لئے تھا کہ پریم چند نے دنیا کے کم و بیش تمام بہترین افسانہ نگاروں کی شاہکار تخلیقات کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے مکاتیب اور مضامین میں جگہ جگہ ان کے حوالے ملتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ہندی کے ممتاز ادیب بنارسی داس چترویدی نے پریم چند سے کچھ سوالات کئے تھے۔ ان کے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند مختصر افسانہ کے فن اور اس کے عالمی معیاروں پر کیسی گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ مکالمہ ملاحظہ ہو:

س: آپ کے خیال میں دنیا کا بہترین افسانہ نگار کون ہے؟

ج: چیخوف۔

س: اور بہترین کہانی؟

ج: اس کا جواب مشکل ہے کیوں کہ کہانیوں کے عنوانات میں بھول جاتا ہوں۔ لیو ٹالسٹائی کی دو زائرین والی کہانی پسند ہے۔ چیخوف کی وہ کہانی بھی مجھے پسند ہے جس میں ماں اپنی بیٹی کی شادی کا جوڑا اور اس کا کفن دونوں سیتی ہے۔ گورکی کی درشٹی دان تو ایسی خوبصورت کہانی ہے کہ دنیا کی بہترین کہانیوں کے مقابل رکھی جا سکتی ہے۔

س: "کابلی والا" کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: اول درجہ کی تخلیق ہے۔ اس کی اپیل آفاقی ہے۔ اس کہانی میں ہندوستانی عورت کے کردار کی پیش کش بے مثل ہے۔ موپساں کی کچھ کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں جنس بہت ہے۔

س: ٹالسٹائی کے مقابلہ میں ترگنیف آپ کی رائے میں کیسا ہے؟

ج: ترگنیف ٹالسٹائی کے مقابلہ میں بونا ہے۔

(قلم کا مزدور ص ۳۴۳)

اس مکالمہ سے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں ہے کہ پریم چند موپساں اور ترگنیف کے مقابلہ چیخوف، ٹالسٹائی اور ٹیگور کے فن کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے کہ یہ ادیب زندگی کے تاریک اور تعفن خیز پہلوؤں کے مقابلہ میں روشن اور صالح پہلوؤں پر زیادہ نظر رکھتے تھے اور ان کی تخلیقات انسان دوستی اور دردمندی کے جذبات سے معمور ہیں۔

پریم چند نے ایک مضمون میں جدید افسانہ کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی قدیم افسانوی تصانیف کتھا سرت ساگر، بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی کی روایات اور ان کی فنی خوبیوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان تمثیلی حکایتوں اور قصوں میں انسان کے کتنے ہی اخلاقی اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ ان قصوں اور حکایتوں کی سادگی اور پرکاری پر خاص طور سے زور دیتے ہیں جو خود ان کے افسانوں کا بھی جوہر ہے۔ جہاں تک افسانہ کی ٹکنیک کا تعلق ہے پریم چند نے ایک طرف ہندوستان کے قدیم قصوں اور لوک کہانیوں اور دوسری طرف مغرب کے طرز جدید کے افسانوں ــــ دونوں سے فیض اٹھایا ہے۔ وحدت تاثر کو وہ مختصر افسانہ کی جان سمجھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ 'افسانہ میں ایک لفظ اور ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے جو اس کے مرکزی خیال کو واضح نہ کرتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اس کا بھی لحاظ ہے کہ افسانہ کی زبان اور پیرایۂ بیان سادہ،

عام فہم اور افسانہ کے بنیادی خیال کے مطابق ہونا چاہئے۔ ایک مضمون میں وہ افسانہ میں تکنیک کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"آج کل کہانی نئے نئے طریقوں سے شروع کی جاتی ہے۔ کہیں دو دوستوں کی باہمی گفتگو سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور کہیں پولس رپورٹ کے ایک ورق سے۔ تعارف (کرداروں کا) بعد میں ہوتا ہے۔ یہ انگریزی (مغربی) افسانہ نگاری کی نقل ہے۔ اس سے کہانی غیر ضروری طور پر پیچیدہ اور مشکل ہو جاتی ہے۔ یورپ کی دیکھا دیکھی خطوں، ڈائریوں یا ذاتی یادداشتوں کے ذریعہ بھی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ میں نے خود بھی ان تمام طریقوں سے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان سے کہانی کی روانی میں رکاوٹ ہوتی ہے۔"

(مضامین پریم چند ص ۱۷۶)

افسانوں کے مجموعوں کی تعداد

اردو میں پریم چند کے افسانوں کے کل کتنے مجموعے ہیں؛ ان کی تاریخی ترتیب کیا ہے؛ وہ کب شایع ہوئے اور ان کے افسانوں کی مجموعی تعداد کتنی ہے؛ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی طرف پریم چند کے ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کا تعین اس لئے بھی ضروری ہے کہ پریم چند کے نام سے کچھ ایسے جعلی مجموعے بھی شایع ہوئے ہیں جو اصل میں پریم چند کے نہیں ہیں۔ میں نے ۱۹۶۸ء میں ایک مضمون میں ان مسائل سے تفصیلی بحث کی تھی اور تحقیق کے بعد کچھ حقائق پیش کئے تھے[1] اس مضمون میں پہلی بار پریم چند کے افسانوں کے مجموعوں کی پہلی اشاعت کا تعین کیا گیا۔ جو تاریخی ترتیب کے ساتھ حسب ذیل ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "پریم چند کی کہانیوں کا مطالعہ" مشمولہ "تلاش و توازن"۔ ترمیمیں۔

مجموعہ	کہانیوں کی تعداد	سال اشاعت
۱۔ سوز وطن	۵	۱۹۰۸ء
۲۔ پریم پچیسی حصہ اول	۱۲	۱۹۱۵ء
۳۔ پریم پچیسی حصہ دوم	۱۳	۱۹۱۸ء
۴۔ پریم بتیسی حصہ اول	۱۵	۱۹۲۰ء
۵۔ پریم بتیسی حصہ دوم	۱۶	۱۹۲۰ء
۶۔ خاک پروانہ	۱۶	۱۹۲۸ء
۷۔ خواب وخیال	۱۴	۱۹۲۸ء
۸۔ فردوس خیال	۱۱	۱۹۲۹ء
۹۔ پریم چالیسی حصہ اول	۲۰	۱۹۳۰ء
۱۰۔ پریم چالیسی حصہ دوم	۲۰	۱۹۳۰ء
۱۱۔ آخری تحفہ	۱۳	۱۹۳۴ء
۱۲۔ زادِ راہ	۱۵	۱۹۳۶ء
۱۳۔ دودھ کی قیمت	۵	۱۹۳۷ء
۱۴۔ واردات	۱۳	۱۹۳۸ء

ان مجموعوں میں پریم چند کی (ہندی سے اخذ ترجمہ) طویل کہانی 'روٹھی رانی' شامل نہیں جو الگ سے شایع ہوئی۔ ان کے علاوہ 'سیر درویش' اور 'کفن' جیسی کہانیاں بھی مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں۔ ان سب کی مجموعی تعداد ۱۹۵ ہوتی ہے۔ جب کہ ہندی مجموعوں میں شائع ہونے والی ان کی کہانیوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ اس میدان میں گزشتہ دنوں ڈاکٹر جعفر رضا نے بھی تحقیق کی ہے۔ موصوف ہندی کے مجموعوں میں شائع ہونے والی پریم چند کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس طرح پریم چند کی کہانیوں کی تعداد ۲۷۲ قرار پاتی ہے۔"

(پریم چند کہانی کا رہنما ص۳۵)

پھر لکھتے ہیں:

"ان کے علاوہ راقم کو اردو اور ہندی کے مختلف رسائل واخبارات اور کہانیوں کے مجموعوں سے سولہ (۱۶) ایسی کہانیاں دستیاب ہوئیں جو اب تک کی فہرستوں میں شامل نہیں تھیں۔ اس طرح ہمارے نزدیک پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو اٹھاسی (۲۸۸) قرار پاتی ہے۔"

(پریم چند کہانی کا رہنما ص۳۷)

ان کی یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس میں پریم چند کی جو سولہ نئی کہانیاں دریافت کرنے کا ذکر کیا ہے ان کی انھوں نے نہ کوئی تفصیل لکھی نہ انھیں شایع کرایا۔ اس دوران ہندی اور اردو کے کئی ناقدین نے قدیم رسائل میں پریم چند کی مزید کہانیاں تلاش کی ہیں اس لئے پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد کے بارے میں حتمی اور قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ خود اردو کے مجموعوں میں ان کی جو کہانیاں ملتی ہیں ان میں سے کئی متنازعہ ہیں۔ کئی ایسی ہیں جو دراصل ترجمہ ہیں لیکن مجموعوں میں طبع زاد کہانیوں کی حیثیت سے شامل ہیں۔ اس میدان میں کئی پہلو کئی مسائل سنجیدہ علمی تحقیق کا مطالبہ کرتے ہیں۔

افسانہ نگاری کا آغاز اور ارتقا

پریم چند کا پہلا طبع زاد افسانہ 'عشق دنیا اور حب وطن' ہے جو 'زمانہ' کانپور میں اپریل ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے شایع ہوا۔ اس سے قبل ان کے چند مضامین اور تین سماجی اصلاحی ناول "اسرار معابد" (ناتمام)، "ہم خرما وہم ثواب" اور "کشنا" شائع ہو چکے تھے۔ اس افسانہ سے پریم چند کی سیاسی فکر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے دو ماہ بعد ہی جون ۱۹۰۸ء میں نواب رائے کے نام سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ سوز وطن شایع ہوا جس میں دوسری چار کہانیوں کے علاوہ "عشق دنیا اور حب وطن" بھی شامل تھی۔ اس کے دیباچہ میں پریم چند لکھتے ہیں :

> "اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم بڑھایا اور حب وطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں ... ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔" (سوز وطن ص۳)

اس مجموعہ میں شامل کہانیاں حسب ذیل ہیں :

۱۔ دنیا کا سب سے انمول رتن ، ۲۔ شیخ مخمور ، ۳۔ یہی میرا وطن ہے ، ۴۔ صلۂ ماتم ، ۵۔ عشق دنیا اور حب وطن ۔

"صلۂ ماتم" کے علاوہ اس مجموعہ کی چاروں کہانیوں کا محرک اور موضوع وطن پرستی کا جذبہ ہے ۔ پریم چند کا دل حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھا اور وہ بعض دوسرے محبان وطن کی طرح چاہتے تھے کہ وطن کی محبت اور آزادی کا یہ جذبہ ملک کے تمام نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن جائے ۔ نومبر ۱۹۰۵ء سے مئی ۱۹۰۸ء تک رسالہ 'زمانہ' میں ہی انھوں نے گوپال کرشن گوکھلے، گیری بالڈی، ٹامس گنز برو اور سوامی وویکانند جیسے وطن پرستوں کے بارے میں سوانحی مضامین لکھے تھے عشق دنیا اور حب وطن میں انھوں نے اٹلی کے نامور محب وطن میزینی کی زندگی کے کچھ اوراق پیش کئے ۔ اور وطن کی خاطر اس کے ایثار و عمل کے حوصلہ خیز واقعات بیان کئے ۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ملک سیاسی اعتبار سے ایک کروٹ لے رہا تھا ۱۹۰۷ء کے سورت کے اجلاس میں کانگرس نرم دل اور گرم دل میں تقسیم ہوگئی ۔ گرم دل کی رہنمائی بال گنگا دھر تلک اور لاجپت رائے کر رہے تھے ۔ وہ تحریک آزادی میں محنت کش عوام کو شامل کر کے انگریزوں کے خلاف محاذ کو مضبوط کرنا چاہتے تھے اگرچہ سماجی اور تہذیبی معاملات میں وہ قدامت پرست تھے اور قدیم آریائی یا ہندو تہذیب کے احیا پر زور دیتے تھے ۔ اسی زمانہ میں بنگال میں دہشت پسند وطن پرستوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ۔ اسی گروہ کے ایک نوجوان خودی رام بوس نے اپریل ۱۹۰۸ء میں مظفر پور میں بم کے دھماکے کئے ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے انگریز حاکم پریشان تھا ۔ اس لئے وطن پرستانہ جذبات کو پھیلانے والی اس کتاب "سوز وطن" کو ضبط کر لیا گیا ۔

اس مجموعہ کے افسانوں میں داستانی اور تمثیلی رنگ غالب ہے ۔ پریم چند اشاروں کنایوں میں اپنے ملک کی غلامی کی روداد سنا کر لوگوں کے دلوں میں قومی ہمت کے جذبات بیدار کرنا چاہتے ہیں ۔ پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن کے آخر میں ہماری ملاقات بھارت کے ایک ایسے

سپاہی سے ہوتی ہے جو آزادی کی جنگ میں زخمی ہوگیا ہے۔ وہ دلفگار سے کہتا ہے۔

"ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں..... کیا میں اپنے ہی دیس میں غلامی کرنے کے لئے زندہ ہوں۔ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔"

ص ۱۴-۱۵

اس کے بعد وہ "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے اور اس کے بدن سے آخری قطرہ خون نکل پڑتا ہے جو دنیا کا سب سے انمول رتن قرار پاتا ہے۔

مجموعہ کی دوسری کہانی "شیخ مخمور" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"ملک جنت نشان کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہ کشور کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور شور کے ساتھ اس پر آیا۔ سارا ملک پامال ہوگیا۔ آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں اور جان و مال کے لالے پڑ گئے۔۔" ص ۱۷

ظاہر ہے کہ یہ ملک "جنت نشاں" ہندوستان ہے اور شاہ کشور انگریز۔ وطن پرستی کا یہ جذباتی تصور جو پریم چند کے یہاں نظر آتا ہے اس عہد کے بعض دوسرے ادیبوں اور شاعروں مثلاً اقبال اور مخدوم کی وطن دوستی سے نوعی اعتبار سے کچھ مختلف ہے۔ وہ لوگ صرف وطن کی عظمت اور اسلاف کے کارناموں کے گن گاتے ہیں جب کہ پریم چند کا زور EMPHASIS اہل وطن کو غلامی کی ذلتوں کا احساس دلانا اور اسے آزاد کرانے کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وطن کی آزادی کا کوئی واضح تصور اس زمانہ میں پریم چند کے ذہن میں نہیں تھا۔

پریم پچیسی حصہ اول و دوم کی کہانیوں کو جو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۷ء کے زمانہ کی تصنیف ہیں، پریم چند کی افسانہ نگاری کا دور اول کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں اگر ایک طرف قوم پرستانہ

خیالات کی اشاعت ہو رہی تھی تو دوسری طرف اصلاحی تحریکیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں سماجی اصلاح اور اجتماعی فلاح کا سکہ جما رہی تھیں۔ پریم چند بھی ان اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھے۔ اس دور کی کہانیوں میں انھوں نے اپنے خیالات کو زیادہ فن کارانہ چابکدستی اور حقیقت پسندانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعد کے دور میں ان کے کرداروں میں تصور پرستی یا ان کے CHANGE OF HEART کے اخلاقی نظریہ کے زیر اثر جو غیر فطری تبدیلیاں راہ پا جاتی ہیں وہ اس دور میں نظر نہیں آتیں اور اگر بعض کرداروں کے رویے یا موقف میں کوئی تبدیلی پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ نفسیاتی طور پر اس کا جواز بھی دکھاتے ہیں اور وہ فطری معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً بڑے گھر کی بیٹی کے انجام میں لال بہاری، آنندی اور سری کنٹھ کے رویوں میں اچانک جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ کہانی کی جذباتی فضا میں ڈرامائی ہونے کے باوجود فطری لگتی ہیں۔ اسی طرح نمک کا داروغہ میں الوپی دین کا بنسی دھر سے انتقام لینے کے بجائے اسے اپنا مختار عام بنانے کی پیش کش نہ صرف اس کی انفرادی بلکہ طبقاتی نفسیات کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔

پریم چند سے پہلے اردو کا افسانوی ادب شہری زندگی اور اس کے مسائل تک محدود تھا۔ پریم چند نے پہلی بار اردو افسانہ میں گاؤں کی کھلی ہوئی زندگی، اس کے میلے ٹھیلے، کھیت کھلیان، چوپال اور گاؤں کے سماجی رشتوں کو پیش کیا۔ ان کے پہلے حقیقت پسندانہ افسانہ "بے غرض محسن" (ستمبر ۱۹۱۰ء) کا ہیرو ایک معمولی غریب کسان ہے۔ اس کے بعد "خون سفید"، "صرف ایک آواز" اور "اندھیر" جیسی کہانیوں میں انھوں نے گاؤں کے نچلے طبقہ کی زندگی، اس کی مفلوک الحالی، محرومیوں اور مجبوریوں کی روداد موثر ڈھنگ سے بیان کی ہے۔ صرف ایک آواز میں انھوں نے اچھوتوں کی المناک زندگی اور اس کے بارے میں ہندو سماج کی بے حسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ "اندھیر" میں پولس اور عمال حکومت کے ہاتھوں سیدھے سادے کسانوں کی لوٹ کھسوٹ کا قصہ سنایا ہے۔ "خون سفید" میں بھی گاؤں کے ہندو سماج میں چھوت چھات کی رسم پر بڑا بھرپور وار کیا ہے۔ گاؤں کے ایک غریب اور قحط زدہ کسان کا چار سالہ بچہ

بھوک میں گھر سے بھاگ کر ایک عیسائی مشنری کے پاس پناہ لیتا ہے۔ وہ اسے تعلیم دلواتے ہیں۔ چودہ سال بعد وہ ایک مہذب نوجوان بن کر جب اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو برادری ماں باپ کو مجبور کرتی ہے کہ اس سے چھوت چھات برتیں لیکن سادھو سختی سے جواب دیتا ہے :

"اپنوں میں غیر بن کر رہوں ؟ ذلت اٹھاؤں۔ مٹی کا گھڑا بھی میرے چھونے سے ناپاک ہو جائے۔ نہ! یہ میری ہمت سے باہر ہے... جن کے خون سفید ہو گئے ہوں ان کے درمیان رہنا فضول ہے۔" (پ۔ پ۔ ص ۱۴۲)

الغرض ملک کے اجتماعی مسائل ہوں یا گھریلو اور انفرادی، پریم چند ایک واضح ترقی پسند نقطۂ نگاہ رکھتے تھے۔ وہ گاؤں میں پلے بڑھے تھے اور ہندو سماج سے تعلق رکھتے تھے اس لئے فطری طور پر ابتدا میں ان کی توجہ کا مرکز یہی سماج تھا۔ آریہ سماجی خیالات بھی اس دور میں ان کی سماجی فکر پر اثر انداز ہوتے۔ لیکن جیسے جیسے ان کے تجربات اور مشاہدات کا دائرہ وسیع ہوا اور وہ ملک کی قومی اور عوامی تحریکوں کے قریب آتے ان کے سماجی شعور میں بھی وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی۔ اور اسی نسبت سے ان کے افسانوں میں بھی تنوع کے ساتھ ساتھ تہ داری، وسعتِ نظر اور فنی تکمیل کے عناصر کا اضافہ ہوا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک کے زمانہ پر محیط ہے۔ اس عہد میں عالمی اور قومی سطح پر بعض اہم اور نتیجہ خیز واقعات رونما ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں عظیم اکتوبر انقلاب کی کامیابی نے ساری دنیا کے مزدوروں اور کسانوں کو ان کے اقتدار کا مژدہ سنایا۔ پریم چند کو، جو ہمیشہ اپنے مقدر کو کسان اور مزدور طبقہ سے وابستہ کرتے تھے، اس انقلاب آفریں واقعہ نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے رولٹ ایکٹ پاس کر دیا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالا باغ کا سانحہ پیش آیا۔ جنگ کے بعد انگریزوں نے جب ترکی کی خلافت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو ہندوستانی مسلمان بپھر گئے۔ الغرض ۱۹۱۹ء میں کانگریس

کے امرتسر اجلاس کے بعد سارے ملک میں ستیہ گرہ، عدم تعاون اور خلافت تحریک کا آغاز ہوگیا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی اور دوسرے رہنماؤں نے تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ وہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کریں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں ہندو مسلمان اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ پریم چند بھی اس تحریک سے اتنا متاثر ہوئے کہ فروری ۱۹۲۱ء میں انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اس دور کے افسانوں میں "پریم بتیسی" کی کچھ کہانیوں کے علاوہ 'خاک پروانہ'، 'خواب و خیال'، 'فردوس خیال' اور 'پریم چالیسی' کی کہانیاں شامل ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے یہ بہت زرخیز زمانہ ہے۔ ملازمت سے الگ ہوکر پریم چند ہمہ وقتی طور پر لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے۔ اب وہ آزادی کے ساتھ گاؤں اور شہر کی عوامی تحریکوں کے بھی قریب آئے اور اس طرح تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی کے حقائق پر سوچنے اور لکھنے کی تحریک بھی ملی۔ اب وہ بلاشبہ ہندی اور اردو کے ممتاز اور نامور ادیب تھے۔ ادبی رسائل بھی ان کی تخلیقات کے لئے اصرار کرنے لگے اور ان کے سنجیدہ قارئین بجا طور پر ان سے یہ توقع بھی کرنے لگے کہ فنی اعتبار سے وہ زیادہ دلکش اور موثر کہانیاں پیش کریں گے۔ اس زمانہ میں جیسا کہ ان کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے انھوں نے چیخوف، ہوپساں، اناطول فرانس اور آسکر وائلڈ جیسے ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ بھی بہت شوق سے کیا لیکن کسی کی تقلید کو انھوں نے اپنا شیوہ نہیں بنایا۔

اردو میں اس زمانہ میں نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم اور بعض دوسرے ادیبوں کے رومانی افسانے بہت شوق سے پڑھے جاتے تھے لیکن پریم چند ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے تنقیدی حقیقت نگاری کی جس روایت کو پروان چڑھایا تھا اسی کی تعمیر و توسیع میں کوشاں رہے۔ ان کے افسانوں میں اس عہد کی تمدنی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے ہر مرحلے کی سچی اور بے لاگ تصویریں ملتی ہیں۔ بھاڑے کا ٹٹو، عجیب ہولی اور ستیہ گرہ جیسی کہانیوں میں اجتماعی سیاسی بیداری کا ماحول سانس لیتا نظر آتا ہے۔ یہاں پریم چند نے موٹے رام شاستری

جیسے کردار پیش کر کے خود غرض اور موقع پرست قومی کارکنوں کا مذاق اڑایا ہے۔ اس عہد میں پریم چند نے اپنی آپ بیتی، اپنے بچپن اور لڑکپن کے واقعات کو افسانوں کے دلکش قالب میں ڈھالا۔ قزاقی، چوری، سوتیلی ماں اور گلی ڈنڈا[1] جیسی موثر کہانیوں میں انھوں نے اپنی ہی سوانح حیات ترتیب دی ہے۔ ان کے شطرنج کی بازی، موٹھ، عیدگاہ اور نوک جھونک جیسی کہانیاں بھی مواد اور افسانہ کی تکنیک پر پریم چند کی قدرت کا ثبوت ہیں۔ لیکن اس دور میں فنی نقطۂ نگاہ سے پریم چند کی شاہکار کہانیاں وہی ہیں جو گاؤں کے ماحول اور زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ پوس کی رات، سوا سیر گیہوں، راہ نجات، سجان بھگت، علیحدگی، مزار آتشیں ـــــ ان کہانیوں میں پریم چند نے اپنے تجربات، اپنے تخیل کی شادابی اور نفسیاتی بصیرت سے جو معاکاتی حسن پیدا کر دیا ہے وہ اس عہد کی دوسری کہانیوں میں کم نظر آتا ہے۔ ان میں سے ہر کہانی انسانی زندگی یا انسانی نفسیات کے کسی گوشہ کو اس طرح بے نقاب کرتی ہے کہ قاری سوچتا رہ جاتا ہے۔ پوس کی رات میں ایسا لگتا ہے جیسے مصنف نے اپنے وجود کو ہلکو کسان کے وجود سے کامل طور پر ہم آہنگ کر لیا ہو۔ اس کی محرومیوں اور دکھوں کی ساری اذیت کو اپنی روح میں گھول لیا ہو۔ ہلکو کا کردار ہندوستانی کسان کی صدیوں کی مظلومی، مجبوری اور افلاس کی علامت ہے۔ دن رات کی محنت کے باوجود دنیا میں کوئی نہیں جو اسے زندہ رہنے کا سہارا دے۔ قدرت بھی بے مہر دشمن کی طرح اس پر گھات لگائے رہتی ہے۔ تنہائی کے اس عذاب میں سوائے وفادار جبرا کے کوئی اس کا شریک نہیں۔

"جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اسے اپنی گود سے چمٹائے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ

---

[1] گلی ڈنڈا کہانی اگرچہ اردو مجموعہ میں بعد میں شایع ہوئی لیکن ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی تھی۔

جنت یہیں ہے۔ وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اس
حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے
کھول دیئے تھے اور اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔"
پوس کی خوفناک سردی میں صرف ایک بجھتا ہوا الاؤ ہی ان کا سہارا ہے۔
"راکھ کے نیچے ابھی کچھ کچھ آگ باقی تھی، جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ
اٹھتی تھی۔ پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔" ——— اور :
"ہلکو ہکا ارادہ کرکے اٹھا۔ دو تین قدم چلا۔ پھر یکایک ہوا کا ایک ایسا
ٹھنڈا چبھنے والا بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ
کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔"
یہاں افلاس اور سردی کی شدت سے ہلکو کا بجھتا ہوا، بے حس ہوتا ہوا وجود ——— بجھتے
ہوئے الاؤ کی راکھ اور حرارت حاصل کرنے کے لئے ایک حیوان جبرا کو آغوش میں سلا لینا
ایسے بلیغ علامتی اظہارات ہیں جو پریم چند کے کمال فن کی گواہی دیتے ہیں۔
پریم چند کی افسانہ نگاری کا تیسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔
اس دور میں ان کے خیالات میں اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اب وہ اصلاحی اور
اخلاقی نقطۂ نگاہ کے بجائے تاریخی اور مادی حقائق کی روشنی میں مسائل کو دیکھنے لگے اور اس
نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے اصلاحات کی نہیں بلکہ سماجی
اور اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان کے آدرش واد کے
اثرات بھی ان کے افسانوں میں بتدریج کم ہوتے گئے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی فرقہ پرستانہ
تحریکوں سے سخت بیزار تھے۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا کہ تہذیب اور زبان کا مذہب
سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب وہ سرمایہ داری اور نجی ملکیت کو ظلم و استحصال اور سماجی بے انصافیوں
کا اصل سبب سمجھتے تھے۔ اپنے مشہور ہندی مضمون "مہاجنی سبھیتا" میں انھوں نے لکھا کہ ہندوستان

میں مساوات، انصاف اور ہر طرح کے ظلم و جبر سے آزاد جمہوری معاشرہ کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب اپنی دولت اور طاقت کی مدد سے استحصال کرنے والے طبقوں سے معاشرہ کو پاک کر دیا جائے۔
پریم چند کے خیالات اور ذہنی رویوں کی یہ تبدیلی ان کے اس دور کے افسانوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔

اس دور میں ان کے چار مجموعے آخری تحفہ، زادِ راہ، دودھ کی قیمت اور واردات شایع ہوئے۔ آخری دو مجموعوں کی اشاعت ان کی موت کے بعد ہوئی۔ ان مجموعوں میں کچھ کہانیاں ایسی بھی شامل ہیں جو ۱۹۳۰ء کے قبل لکھی گئیں۔

۱۹۳۲ء میں جب پریم چند کی کہانی 'نجات' شایع ہوئی تو ہندی رسالہ 'سرسوتی' کے ایک مضمون میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں خاص کر برہمنوں کے خلاف نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں پریم چند نے 'ہنس' میں ایک مضمون لکھا "زندگی میں نفرت کا مقام"، جس میں برہمنوں، مہاجنوں اور غریب انسانوں کا خون چوسنے والے لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو جائز اور فطری قرار دیا۔ دراصل پریم چند کے دل میں سماج کے دبے کچلے ہوئے غریب انسانوں کے لئے بے پناہ ہمدردی تھی۔ اب یہ حقیقت ان پر روشن ہو گئی تھی کہ مہاجنوں، برہمنوں یا زمینداروں کا قلب ماہیت کر کے کروڑوں غریب انسانوں کی غریبی دور نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ظلم اور ظالم دونوں کے خلاف انسانی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ 'نجات'، 'دودھ کی قیمت' اور 'کفن' ایسی کہانیاں ہیں جن میں پریم چند کی حقیقت پسندی زندگی کی المناک سچائیوں کو برہنہ کر کے پیش کر دیتی ہے۔ ان میں جو کردار ہیں دکھی، ہنگل، گھیسو، مادھو ـــــ وہ اس سماج میں جانوروں سے بھی زیادہ گھناؤنی زیادہ ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

پریم چند کی تصور پرستی اب تک ہندوستانی عورت کو پتی ورتا اور گرہست عورت کے روپ میں دیکھنے پر اصرار کرتی تھی لیکن اس دور میں انھوں نے 'مالکن'، 'نوک جھونک'،

'نئی بیوی' اور 'مس پدما' جیسی کہانیاں لکھیں جن میں عورت کی آزادی اور اس کے انسانی حقوق پر زور دیا۔ 'نئی بیوی' کی آشا اپنے بوڑھے شوہر کی دلجوئی کے باوجود مجبور ہوتی ہے کہ اپنی فطری خواہشات کی تسکین کے لئے اپنے ہم سن ملازم جگل سے رشتہ قایم کرے —— ایک ایسا رشتہ جو ہندو دھرم اور سماج کے قوانین کی رو سے جرم ہے لیکن پریم چند اس جرم کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ اسی طرح دوسرے سماجی مسائل کے بارے میں پریم چند کا نقطہ نگاہ اب زیادہ عقلی اور حقیقت پسندانہ ہو گیا تھا۔

پریم چند کے بیشتر افسانے سیدھی سادی بیانیہ ٹکنیک میں لکھے ہوئے ہیں لیکن اپنے مواد کی نوعیت اور ضرورت کے مطابق انھوں نے ٹکنیک کے تجربے بھی کئے ہیں۔ آخری حیلہ، شکوہ و شکایت، نوک جھونک جیسے افسانوں کی ٹکنیک بیانیہ سے ذرا مختلف ہے۔ ان میں وہ کبھی واحد متکلم میں، کبھی کرداروں کی خود کلامی کے انداز میں جذباتی اور ذہنی حقائق کے ایسے پیکر تراشتے ہیں۔ ایسی ڈرامائی فضا کی تخلیق کرتے ہیں کہ قاری محو ہو جاتا ہے۔ دراصل ان کی وہ کہانیاں بھی جو بظاہر بیانیہ ٹکنیک میں ہیں انسانی فطرت اور نفسیات کے بڑے تہ دار اور پراسرار گوشوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کی ظاہری سادگی کے پس پردہ انسانی جذبات اور احساسات کی نیرنگیاں، اس کے بے کراں دکھوں کی پرچھائیاں اس طرح متحرک ہوتی ہیں کہ قاری اس طوفان اور تموج میں اپنے آپ کو بہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

پریم چند کے فن کی ایک بڑی قوت ان کی سادہ اور سلیس زبان اور شفاف اور بے تکلف طرز تحریر ہے۔ انھوں نے بول چال کی عام فہم زبان کو تخلیقی زبان کا درجہ عطا کیا اور اردو کے افسانوی ادب کو ایک ایسا جاندار اور شگفتہ اسلوب دیا جو تصنع، تکلف اور ہر طرح کی آرائش سے پاک ہے۔ فکر و اظہار کا یہی وہ سادہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب ہے جو جدید اردو افسانہ میں پریم چند کی روایت کے تحفظ اور تسلسل کی شناخت بن گیا ہے۔

بڑے گھر کی بیٹی

(۱)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی، جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کی نذر کی، اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سری کنٹھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہادر سنگھ دوہرے بدن کا سجیلا نوجوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اس سے بالکل متضاد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انھوں نے دو انگریزی حروف بی۔ اے۔ پر قربان کر دیا تھا۔ انھیں دو حرفوں نے ان کے سینے کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقت فرصت طب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے

سے اکثر کھل کی خوشگوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط وکتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مداح نہ تھے بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شد و مد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے اور خود ہر روز کوئی نہ کوئی روپ بھرتے۔ انھیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا۔ خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اسے وہ ملک اور قوم کے لئے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انھیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انھیں اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔ خود انھیں کی بیوی ان سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس سسر دیور جیٹھ سے نفرت تھی بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالی شان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن، بہلیاں، شکاری کتے، باز، بحری، شکرے، جرے، فرش، فروش، شیشہ، آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں وہ ان سب سے بہرہ ور تھے بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل حوصلہ مند آدمی تھے مگر قسمت کی خوبی لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں

ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو تین شادیاں انھوں نے دل کھول کر کیں مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں، ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اسے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا کہ اسے اپنے آپ کو بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس کسی چندے کے لئے روپیہ مانگنے آئے۔ شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور طریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھیں ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا کیا ذکر کوئی بگی ہوتی خوبصورت بہلی بھی نہ تھی۔ ریشمی نیلپر ساتھ لائی تھی مگر یہاں باغ کہاں۔ مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ زمین پر فرش، نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغیاں لیے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا جلدی سے گوشت پکا دو مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی، کفایت شعاری کا سبق اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔

لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے "دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"
آنندی۔ آج تو کل پاؤ بھر تھا وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔
جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا "میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو"
عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی "ہاتھی مرا تو بھی نو لاکھ کا، وہاں اتنا گھی روز نائی کمہار کھا جاتے ہیں"
لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا "جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے"
آنندی کو بھی غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی "وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے"
اب تو جوان اجڈ ٹھاکر سے جبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا "جس کے گمان پر پھولی ہوئی ہو اسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی"
آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا میں ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت مرد کی ذات سے ہے۔ اسے شوہر کی طاقت اور مرد کی ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

سرن کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا، ان کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسب معمول شام کے وقت

وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے اور سلسلہ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے اور بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا: "بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجیے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں، ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔"

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی: "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے منہ لگیں۔"

لال بہاری۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔

سری کنٹھ۔ آخر بات کیا ہوئی؟

لال بہاری۔ کچھ بھی نہیں، یوں ہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں، میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا: "مزاج تو اچھا ہے؟"

سری کنٹھ بولے: "بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آگیا۔ بولی: "جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔"

سری کنٹھ۔ اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو کچھ بات تو کہو۔

آنندی۔ کیا کہوں قسمت کی خوبی ہے ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراسی گیری کرنے کی بھی تمیز نہیں، مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا۔ بوٹیاں نچوالیتی۔ اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے۔

سری کنٹھ ۔ آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو ۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ۔

آنندی ۔ پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا ۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا ۔ جب بیٹھا تو کہنے لگا دال میں گھی کیوں نہیں ہے ۔ بس اسی پر میرے میکے کو برا کہنے لگا ۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی ۔ بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی ۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری ، اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی تو سر پھٹ جاتا ۔ اس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ ہے ۔

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں بولے " یہاں تک نوبت پہنچ گئی ۔ یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا ۔

آنندی رونے لگی ، جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے کیوں کہ آنسو ان کی پلکوں پر رہتا ہے ۔ عورت کے آنسو مرد کے غصے پر روغن کا کام کرتے ہیں ۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا ۔ انھیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا ۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے " دادا اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا ۔

یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لیے سری کنٹھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا ۔ جب ان کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور کہتے تم لوگ بیویوں کے غلام ہو ، انھیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو ۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پرجوش وکیل اپنے باپ سے کہہ رہا تھا ۔

" دادا ! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا " ناصح کی زبان اسی وقت چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے ۔ آزمائش میں آکر ضبط اور علم رخصت ہو جاتے ہیں ۔

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے "کیوں؟"

سری کنٹھ۔ اس لیے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسروں کا غلام ٹھیرا۔ گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ کڑی بات تو مضائقہ نہیں، کوئی ایک کی دو کہہ لے، یہاں تک تو ضبط کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسیں پڑیں اور میں دم نہ ماروں۔

بینی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کیا کرتے تھے۔ ان کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہو گیا۔ صرف اتنا بولا "بیٹا تم عقلمند ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، عورتیں اس طرح گھر تباہ کر دیتی ہیں۔ ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔"

سری کنٹھ۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علیحدگی کی آفتوں سے بچایا ہے۔ مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں کر سکتا۔ آپ یقین مانیے میں اپنے اوپر بہت جبر کر رہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔

اب بینی مادھو سنگھ بھی گرما گئے۔ یہ کفر زیادہ نہ سن کے بولے "لال بہاری تمہارا بھائی ہے۔ اس سے جب کبھی بھول چوک ہو تم اس کے کان پکڑو، مگر ...

سری کنٹھ۔ لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔

بینی مادھو۔ عورت کے پیچھے۔

سری کنٹھ۔ جی نہیں اس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث۔

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ کچھ دھیما کرنا چاہتے تھے مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ اور تمباکو اڑانے کے لیے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادہ جنگ ہیں تو ان کا دل بہت خوش ہوا اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سننے کے لیے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ حاسد بھی اس گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا تھا اس لیے وہ خطاوار ہے۔ اس نے اتنا علم حاصل کیا یہ بھی اس کی خطا ہے بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں یہ بری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے، یہ ان کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں بر آئیں حقہ پینے کے بہانے سے، کوئی لگان کی رسیدیں دکھلانے کے حیلے سے آ آکر بیٹھ گئے۔ بینی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے۔ اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں خوش نہ ہونے دوں گا خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجہ تقریر نرم کرکے بولے "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں، تمھارا جو جی چاہے کرو، اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی۔"

الہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی مگر عملی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا "میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ۔ بیٹا! تم عقلمند ہو اور عقلمند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے۔ اس سے جو کچھ خطا ہوئی اسے تم بڑے ہو کر معاف کردو۔

بیٹا۔ اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کرسکتا یا تو وہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجیے میں اپنا بوجھ آپ اٹھا

لوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیے کہ جہاں چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا چپ چاپ بڑے بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے یا حقہ پی لے، یا پان کھالے۔ اپنے باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں انھوں نے کبھی اسے گھڑکا تک نہیں۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مگدر کی جوڑی انھوں نے بنوادی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو انھوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جا کر اسے گلے سے لگا لیا تھا اور پانچ روپے کے پیسے لٹا دیئے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا کہ دیکھو بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں ان سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں ان کے سامنے کیسے اٹھیں گی۔ اس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلا کر سمجھا دیں گے۔ اس امید کے خلاف آج وہ انھیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اکیلا بلا کر اسے دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اسے ملال نہ ہوتا مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں، لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں گیا اور کوٹھری میں جا کر کپڑے پہنے، آنکھیں پونچھیں، جس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازے پر آ کر بولا "بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے وہ اب میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے، اس لیے اب میں جاتا

ہوں انھیں پھر منھ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا۔"
یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہوگئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اسی وقت سری کنٹھ بھی آنکھیں لال کیے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور کترا کر نکل گئے گویا اس کے سائے سے پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو پھر میں کیا کروں گی۔ یہ خیال اس کے چہرے کو زرد کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اب میں جاتا ہوں، مجھ سے خطا ہوئی ہے معاف کرنا تو اس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہوگیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا: "لالہ باہر کھڑے ہیں بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ۔ تو میں کیا کروں؟

آنندی۔ اندر بلا لو۔ میری زبان میں آگ لگے، میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اٹھایا۔

سری کنٹھ۔ میں نہیں بلانے کا۔

آنندی۔ پچھتاؤ گے۔ انھیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔

سری کنٹھ نہ اٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ بھابی! بھیا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا منھ دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے میں بھی اپنا منھ انھیں نہ دکھاؤں گا۔

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "مجھے جانے دو"۔

آنندی۔ کہاں جاتے ہو؟

لال بہاری۔ جہاں کوئی میرا منھ نہ دیکھے۔

آنندی۔ میں نہ جانے دوں گی۔

لال بہاری۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہوں۔

آنندی۔ تمھیں میری قسم، اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔

لال بہاری۔ جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے گا کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا ہے تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔

آنندی۔ میں ایشور کی سوگندھ کھا کر کہتی ہوں کہ تمھاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔

اب سری کنٹھ کا دل پگھلا۔ انھوں نے باہر آ کر لال بہاری کو گلے لگا لیا اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا "بھیا! اب کبھی نہ کہنا کہ تمھارا منھ نہ دیکھوں گا، اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا"۔

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "لو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ۔ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا"۔

بینی مادھو سنگھ باہر سے آ رہے تھے، دونوں بھائیوں کو گلے ملتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اٹھے "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں"۔

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔

"بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں"۔

نمک کا داروغہ

(۱)

جب نمک کا محکمہ قایم ہوا اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازہ صدر بند پاکر روزن اور شگاف کی فکر کرنے لگے۔

چاروں طرف خیانت، غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوار گری کا معزز اور پرمنفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغہ نمک کی برقندازی کرتے تھے اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لیے بھی رشک کا باعث تھا.... یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی۔ لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے کبھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصے کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے۔ بیٹا! گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمھیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے۔ ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ

پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہوجاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اس لیے اسی میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لیے اس میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو، تمھیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو، اس کی ضرورت کو دیکھو، موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو، میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔"

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے، خوبیِ قسمت ساتھ تھی، صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہوگئے۔ مشاہرہ معقول، بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہوگئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سندلی، پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بزمی ہوگئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے، رات کا وقت۔ نمک کے برقنداز چوکیدار، شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن اس عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کیے ہوئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا

شور غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اٹھ بیٹھے۔ اتنی رات گئے کیوں گاڑیاں دریا کے پار جاتی ہیں۔ اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں؟ شبہ کو استدلال نے ترقی دی۔ وردی پہنی۔ طمنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پن سے اتر رہی ہے، حاکمانہ انداز سے بولے۔

"کس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر سناٹا رہا، آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا "پنڈت الوپی دین کی"۔

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج والے"۔

بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا۔ لاکھوں کی پنڈیاں چلتی تھیں، غلے کا کاروبار الگ، بڑا صاحب اثر، بڑا حکام رس۔ بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا کہاں جائیں گی؟ جواب ملا کہ کانپور۔ لیکن اس سوال پر کہ ان میں ہے کیا؟ ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے، کیا تم سب گونگے ہوگئے۔ ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے؟

(۳)

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے بگھیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ کئی گھبرائے

ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے "مہاراج درونگا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں"۔

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے۔ اچھا چلو ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے، بابو جی اشیرباد! ہم سے کیا ایسی خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیے۔

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا، بے اعتنائی سے بولے "سرکاری حکم"۔ سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے۔ کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانت داری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ! تم انھیں حراست میں لے لو۔ میں حکم دیتا ہوں۔

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہواخواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرطِ رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے کبھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا، سکتے میں آگئے۔

خیال کیا کہ ابھی طفل مکتب ہے۔ دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا۔ الھڑ ہے جھجکتا ہے زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز میں بولے "بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجیے ہم مٹ جائیں گے۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ بہت ہوا تھوڑا سا انعام و اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں"۔

بنسی دھر نے سخت لہجہ میں کہا "ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے"۔

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتماد نفس اور غرور دولت کو صدمہ پہنچا۔ لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے "لالہ جی ایک ہزار کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو، آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں"۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا "ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا"۔

دولت فرض کی اس خامکارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی اور اب دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکہ کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کیے۔ ایک سے پانچ ہزار تک۔ پانچ سے دس ہزار تک۔ دس سے پندرہ۔ پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے "اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے"۔ بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے "بابو صاحب! ایشور کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں"۔

"غیر ممکن"

"تیس ہزار"

"غیر ممکن"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں؟"

"چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ میں اب ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا"

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لیے ہوئے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۴)

دنیا سوئی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں۔ گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والے حکام سرکار، ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ۔ یہ سب پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غصہ و غم تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں شاید شوق نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرت ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے۔ حکام ان کے قدر شناس، عملے ان کے نیاز مند، وکیل اور مختار ان کے ناز بردار اور اردلی، چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خرید غلام تھے۔ انھیں دیکھتے ہی چاروں طرف

سے لوگ دوڑ پڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لیے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لیے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا، سچائی کے سوا کچھ پاس نہیں، صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھنچا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہو جائے گا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ صاحب ثروت رئیس تھے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدہ کے لیے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہیں لیکن صیغہ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز اور درک کو مغلوب کر دیا ہے۔ اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیے۔

وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے حوالیوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے، نگاہیں غرور سے لبریز،

طعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کیے لیکن ایک اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا ناید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق ے دیا تھا۔ انصاف، علم اور پنچ حرفی خطابات اور لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے بنے ایک بھی حقیقت میں عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجبی نی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کہار اور بوجھ کے تقاضے ہیں، بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی لری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانتدار نے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے۔ تف ایسی سمجھ پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے نی جی نے روداد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے "جی چاہتا ہے اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں"۔ ت دیر تک پچتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت و سست بھی کہا اور ی دھر وہاں سے ٹل نہ جاتے تو عجب نہ تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے کئی دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دل دوز ہمدردیاں سہتے سہتے ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا بوڑھے منشی جی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے

دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رکا۔ سبز اور گلابی رنگ کے پردے، پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے، سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے، منشی جی پیشوائی کو دوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر سلام کیا اور مدبرانہ درافشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کون سا منہ دکھائیں۔ منہ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے ناخلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا لیکن شان خودداری لیے ہوئے۔ فوراً گمان یہ ہوا کہ یہ حضرت مجھے بلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندہ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گذرا۔ یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا "نہیں بھائی صاحب ایسا فرمائیے بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے فوراً جواب دے دیا۔ انداز حیرت سے بولے۔

"ایسی اولاد کو اور کیا کہوں؟"

الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پاکر پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی اسے زمانہ سازی نہ سمجھیے۔ زمانہ سازی کے لیے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لے لیا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں میں نے ہزاروں رئیس اور امیرزادے دیکھے، ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے۔ میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟"

بنسی دھر کو ان باتوں سے کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اٹھائی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے۔

"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ فرض نے مجھے آپ کی بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا بحد امکان اس کی تعمیل میں عذر نہ کروں گا۔"

الوپی دین کی التجا آمیز نگاہوں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "دریا کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن یہ سوال پورا کرنا پڑے گا۔"

بنسی دھر نے جواب دیا۔ "میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی اس میں دریغ نہ ہوگا۔"

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمائیے اور اس پر دستخط کر دیجیے۔ میں برہمن ہوں۔ جب تک یہ سوال پورا نہ کیجیے گا میں دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"

بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انھیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دے دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ۔ جیب خرچ کے لیے روزانہ خرچ الگ، سواری کے لیے گھوڑے، اختیارات غیر محدود۔

کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔

"پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے آپ نے عنایات بیکراں کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"

الوپی دین بولے۔

"اپنے منھ سے اپنی تعریف نہ کیجیے۔"

بنسی دھر نے متین آواز سے کہا۔

"میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لیے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ

ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لیے ایک بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت۔

الوپی دین نے قلم دان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی، نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار پرکھ چکا ہوں۔ اب حسنِ تقدیر اور حسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے۔ زیادہ تامل نہ کیجیے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجیے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت، سخت زبان، تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظروف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔

الوپی دین فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور انھیں گلے لگا لیا۔

حج اکبر

(۱)

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل وجان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کیچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی۔ کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی۔ پرکھتی۔ بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں

گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روزیہ ڈرامہ دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

(۲)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ ان کا مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی تمثیلی تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلازاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینان سب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرفِ دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی، ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی۔ وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعثِ تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہوگئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ پر تماشا اتنا دلاویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔ بی بی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہوگئی اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے، تمھیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔

بچہ کو گود میں لینے چلی پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا "رہنے دو، تمھارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی "تمھارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھائیے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی"۔

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی "بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلا

رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔"

شاکرہ : تو یہاں تمھاری کون پرواہ کرتا ہے۔ تمھاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ : ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو، معاف کیجیے گا۔ میں جاتی ہوں۔

شاکرہ : جاکر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔

دایہ : میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجیے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا "کیا ہے؟"

دایہ : کچھ نہیں، بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین خانگی تردد سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انھیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہوکر بولے "کیا بات ہوئی؟"

شاکرہ : کچھ نہیں، اپنی طبیعت، نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر : تمھیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔

شاکرہ : ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمھیں یہ بہت پیاری ہے تو لے جاکر گلے باندھو۔ میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

(۳)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا اور انا انا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا، پیار کیا، گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا، میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوا کی دھمکی دی مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آگیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی نصیر کا منہ اور گال لال ہوگئے۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی تو اسے تسکین ہوئی مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا "انا مٹھائی لائی؟"

اس طرح دو تین دن گذر گئے۔ نصیر کو انا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انا جیسی جیتی جاگتی، پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی، گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا اور انا انا پکار کے رونے لگتا کبھی دروازہ پر جاتا اور انا انا پکار کر ہاتھ سے اشارہ کرتا گویا اسے بلا رہا ہے۔ انا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے امید ہوتی تھی کہ انا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھری کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا

کہ شاید انا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا تو انا انا کہہ کر دوڑتا سمجھتا کہ انا آگئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے، میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے، نہ تازی امرتیوں سے۔ ان میں مزہ تھا جب انا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی، گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخوان کا ایک پتلارہ گیا تھا۔ شاکرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے۔ نت نئے کھلونے لاتے۔ یہ مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزی کی بہار کیوں کر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا، سناٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھتنی ہے۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت، وہی پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار، وہی دلکش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھا انا سے باتیں کرتا۔ انا کتا بھونکے۔ انا گائے دودھ دیتی۔ انا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی دایہ کی کوٹھری میں جاتا اور کہتا "انا پانی پی"۔ دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھری میں رکھ آتا اور کہتا "انا سوتی"۔ شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا کر انا کی کوٹھری میں لے جاتا اور کہتا "انا کھانا کھائے گی"۔ انا اس کے لیے اب ایک آسمانی وجود

تھی جس کی واپسی کی اب اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گذشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھا۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بیتابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکل، ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گذر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی، کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نحافت اس موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی، اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی، ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

(۴)

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے کم بولتے تھے۔ انھیں اس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف، سفلہ مزاج، بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے۔ شاید انھیں کی دوا سے فائدہ ہو۔ صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا "بڑے حکیم نہیں، لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا"

شاکرہ: تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟

صابر: بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ: تمہیں تو وہی دھن سوار ہے۔ کیا جانے امرت پلا دے گی؟

صابر: ہاں وہ تمھارے لیے چاہے زہر ہو لیکن بچے کے لیے امرت ہی ہوگی۔

شاکرہ: میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔

صابر: اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی، بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ: چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر: ہاں تو نہیں جاتا ہوں مگر یاد رکھو یہ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عباسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو، التجا کرو۔ تمھارے بچے کی جان اسی کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا "کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں؟"

شاکرہ: "تم کیوں جاؤ گے میں خود چلی جاؤں گی۔"

صابر: نہیں، معاف کرو۔ مجھے تمھارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمھارے منھ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا "ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی، اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی اور وہ جس طرح راضی ہوگی، اسے راضی کروں گی۔"

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں مگر امڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے "میں تمھارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔"

(۵)

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرادیں۔ بادِ حوادث نے درخت کو پامال کر دیا اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی کہ اسے نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی، کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک تانے

حلوے کی صدا سُن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آگیا آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا۔ وہ نغمہ مسرت سننے کے لیے جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بیقراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے کبھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی اس لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منہ دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہردم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلا دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آگئے۔ محلہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ وہ آمادۂ سفر ہوگئی۔

(۶)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی

اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا" دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا۔ اور باغ کے پاس گیہوں"۔ کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا" آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا"۔ ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے" مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جائیے گا اور جلتر مال لیجیے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا"۔ مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادات کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی" ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت، لین دین کے چرچے! نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی ـــــ یا اللہ! کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا اُمڈی ہوئی ہے، برسنے کا نام ہی نہیں لیتی معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں۔ جھوٹ موٹ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے ـــ" کیوں عباسی! تم بھی حج کو چلیں؟"

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا" ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر : اب تو تم جا رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی۔ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر : اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو انا انا کی رٹ لگاتا رہا اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟"

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی ــــ "اللہ میری جان کے صدقے۔ میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔" رقت سے گلا بھر آیا ــــ "میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی، بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لیے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھ کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے۔" انداز وحشت سے بولی "دودھ تو پیتے ہیں نا

صابر : تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔

عباسی : یا میرے اللہ! ارے او قلی! قلی! بیٹا! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے

اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا جلدی کر۔ میاں! دیکھیے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کر لیجیے"۔
یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔
عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی "بیٹا جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی"۔ راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا تو عباسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا۔ سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ سب خیر و عافیت ہو۔
یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔
آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔
عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا "بیٹا نصیر! آنکھیں کھولو!"
نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا "انا آئی۔ انا آئی"۔
نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔

ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کر کے بولے "تمھاری انا کو مار بھگا دیں" نصیر نے منہ بنا کر کہا "نہیں روئے گی"

عباسی بولی "کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟"

صابر حسین نے مسکرا کر کہا "تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے"

نوک جھونک

بیوی

میں درحقیقت بدنصیب ہوں ورنہ کیوں مجھے روز ایسے نفرت انگیز مناظر دیکھنے پڑتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ مجھے دیکھنے ہی نہیں پڑتے بلکہ بدنصیبی نے ان کو میری زندگی کا جزو خاص بنا دیا ہے۔ میں اس عالی ظرف برہمن کی لڑکی ہوں جس کا احترام بڑی بڑی ہندو مذہبی سوسائٹیوں میں کیا جاتا ہے، جو آج مذہب کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے گھر پر کبھی بغیر نہائے اور پوجا کیے منہ میں پانی کی ایک بوند تک بھی ڈالی ہو۔ مجھے ایک بار بخار کی حالت میں بغیر نہائے ہوئے مجبوراً دوا پینا پڑی تھی اس کا مجھے مہینوں رنج رہا۔ ہمارے گھر میں دھوبی قدم نہیں رکھنے پاتا تھا۔ چماریاں تو دالان میں بھی نہ بیٹھ سکتی تھیں۔ اور جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتے ہوئے مجھے سخت نفرت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یہاں آکر گویا میں ایک ظلمت کدہ میں پہنچ گئی۔ میرے شوہر بڑے رحیم، خوش اخلاق قابل شخص ہیں۔ ان کے یہ اوصاف دیکھ کر میرے باپ ان پر محو ہوئے۔ لیکن افسوس! وہ کیا جانتے تھے کہ یہ لوگ ایسے لامذہب ہیں۔ سندھیا عبادت تو درکنار، کوئی یہاں روزانہ نہاتا بھی نہیں۔ ہمیشہ کمرے میں مسلمان، عیسائی آیا کرتے ہیں اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی، چائے دودھ پی لیتے ہیں اور صرف اس قدر نہیں بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے مٹھائیاں بھی کھا لیتے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے انھیں لیمنڈ پیتے دیکھا تھا۔ سائیس جو چمار ہے بغیر روک ٹوک گھر میں آتا ہے اور بورے سے چنے نکال لے جاتا ہے۔ سنتی ہوں وہ اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے بھی جایا کرتے ہیں۔ بے عنوانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔ میری طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آجاتے ہیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر قریب بیٹھا لیتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اپنی اس ذلت پر اپنے نامعقول طرز زندگی پر میرے چشم دل سے لہو کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اف! ہندو قوم! تو نے ہم عورتوں کو ایسا کمزور بنا دیا۔ کیا اپنے خاوند کی لونڈی بننا ہی ہماری زندگی کا فرض اولیٰ ہے۔ کیا ہمارے خیال، ہمارے ارادے اور ہمارے فرائض کی کچھ قیمت نہیں۔

اب مجھے صبر نہیں آتا۔ آج میں ان حالات کا فیصلہ کر دینا چاہتی ہوں۔ میں اس بلا سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ شرمناک زندگی اب مجھ سے ایک ساعت بھی نہیں برداشت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے دامن میں پناہ لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آج یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ میرے شوہر صرف اس میں شامل ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے خاص محرکوں میں ہیں۔ انھیں کی کوشش اور ایما سے اس نامہذبانہ بدعت کا ظہور ہوا ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ سنتی ہوں مسلمان بھی اس قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ کیا بھگوان مذہب کی حفاظت کے لیے اب اوتار نہ لیں گے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کسی مذہبی کجروی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ برہمن ذات اپنے خاص بھائیوں کے علاوہ دوسرے برہمن تک کا چھوا ہوا کھانا گوارا نہیں کرتی۔ وہی ذی وقعت قوم آج اس پستی کو پہنچ گئی ہے کہ کائستھوں، بنیوں، مسلمانوں کے ساتھ تک بیٹھ کر کھانے میں دریغ نہیں کرتی بلکہ اسے قومی عروج اور قومی اتحاد کا باعث سمجھتی ہے۔

شوہر

وہ کون سا مبارک وقت ہوگا جب کہ اس ملک کی عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں گی۔ قومی شیرازہ بندی میں مردوں کا ساتھ دیں گی؟ یہ مذہبی تنگ خیالیاں کب مٹیں گی؟ ہم کب تک برہمن غیر برہمن کی قید میں پھنسے رہیں گے۔ ہمارے شادی بیاہ کے طریقے کب تک خاندانی قید کی رسی سے بندھے رہیں گے۔ ہم کو کب معلوم ہوگا کہ عورت اور مرد کے خیالات کی موافقت نسبتی پابندیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برندا میری زوجہ نہ ہوتی۔ اور نہ میں اس کا شوہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ وہ ظاہر نہیں کہتی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے آزاد خیالات کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھونا بھی نہیں چاہتی۔ یہ اس کا قصور نہیں۔ یہ ماں باپ کا قصور ہے جنھوں نے ہم دونوں پر ایسا ظلم کیا۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ برندا اتنی خوددار ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مشکلات میں بھی اپنے خیالات پر خواہ وہ صحیح ہوں یا غیر صحیح نہایت مضبوطی کے ساتھ قایم رہتی ہے۔

کل برندا کھل پڑی۔ میرے کئی دوستوں نے عام دعوت کی تجویز کی تھی۔ میں نے بخوشی اس کی تائید کی تھی۔ کئی دن کی بحث و تکرار کے بعد آخر کل میرے گنے گنائے دوستوں نے دعوت کا سامان کر ہی ڈالا۔ ماسوا میرے صرف چار برہمن تھے۔ باقی بقال کائستھ اور چند اور مذاہب کے لوگ تھے۔ یہ آزاد روی برندا کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا تو وہ ایسی بے چین تھی گویا اس کے دل پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میری طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"اب تو بہشت کا دروازہ ضرور کھل گیا ہوگا؟"

یہ ناملائم الفاظ میرے دل پر تیر کی طرح لگے۔ کرخت آواز سے بولا "بہشت اور دوزخ کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں، مردہ ہیں۔ ہماری دوزخ اور بہشت سب

اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دارِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

برندا: "آفریں ہے آپ کی ہمت اور مردانگی کو۔ اب دنیا میں آرام چین کا راج ہو جائے گا۔ دنیا کو آپ نے بچا لیا۔ اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟"

میں نے جھلا کر کہا "جب ایشور نے تمھیں ان باتوں کے سمجھنے کی قوت ہی نہیں دی تو میں تمھیں کیا سمجھاؤں۔ اس باہمی تفریق اور تمیز سے ہمارے ملک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اسے موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس تفرقہ کے مٹنے سے قوم کو جو نفع ہوگا وہ اظہر من الشمس ہے۔ البتہ جو لوگ جان کر بھی انجان بنیں۔ ان کی دوسری بات ہے۔

برندا: کیا بغیر ایک ساتھ بیٹھ کر کھائے ہوئے آپس میں محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔ میں نے اس بحث میں پڑنا فضول تصور کر کے ایسے اصول کی آڑ لینا مناسب خیال کیا جس میں مباحثہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ برندا مذہبی عقائد پر جان دیتی ہے۔ میں نے اس منتر سے اسے تسخیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگ مذہبی عقائد کا بھی احترام نہیں کرتے۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ذرا غور تو کرو۔ یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کی تخصیص کریں۔ یہ ساری دنیا اسی معبودِ حقیقی کا جلوہ ہے۔ ہر ایک ذی روح اسی نورِ حقیقی سے منور ہے۔ صرف اسی نفسانیت کے پردہ نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی خود پروری نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے ورنہ دراصل ہم سب ایک ہیں۔ جس طرح سورج کی روشنی مختلف مکانوں میں جا کر اختلافی صورت نہیں اختیار کرتی اسی طرح پروردگارِ عالم کی روشنی بھی مختلف اجسام میں جاں گزیں ہو کر علٰحدہ نہیں ہو جاتی۔ کیا سورج کی روشنی بھی مختلف اجسام میں جاں گزیں ہو کر علٰحدہ نہیں ہو جاتی۔ کیا سورج کی روشنی جھونپڑوں پر نہیں پڑتی۔ میں تو کہوں گا کہ جھونپڑیوں پر محلوں سے کہیں زیادہ پڑتی ہے۔ علیٰ ہذا میرے اس عارفانہ سیلاب نے برندا کے سوکھے ہوئے دل کو شاداب کر دیا۔ ہمہ تن گوش ہو کر میری باتیں سنتی

رہی۔ جب میں خاموش ہوگیا تو اس نے میری طرف ارادت مندانہ نگاہوں سے دیکھا اور رونے لگی۔

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے مگر اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ برندا کے من سے خاندانی عظمت اور قومی غرور کے حروف مٹ گئے۔ ان کی جگہ عالم گیر روحانی ارتباط کے حروف منقوش ہو گئے۔

بیوی

سوامی جی کے گیان اپدیش نے مجھے بیدار کر دیا۔ اف میں اندھے کنویں میں پڑی تھی۔ اس نے اٹھا کر مجھے ایک روشن قلعہ کوہ پر پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اعلیٰ خاندان کے غرور میں اپنی اونچی ذات کے ناجائز فخر میں کتنے ہی نفوس کی بے عزتی کی۔ اے پرماتما تو مجھے معاف کر۔ میں نااہل تھی، ناسمجھ تھی۔ مجھ غریب کی اس دعا کو قبول کر۔ اس خیال کے باعث میرے دل میں اپنے قابلِ احترام شوہر سے جو کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ اور جو محبت کی کمی میری طرف سے ظاہر ہوئی اسے معاف فرما۔

جب سے میں نے وہ نورانی الفاظ سنے ہیں، میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔ طرح طرح کے نیک ارادے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

کل دھوبن کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس کے سر میں بڑا درد تھا۔ کراہ رہی تھی۔ پہلے میں اسے اس حالت میں دیکھ کر شاید زبانی ہمدردی کرتی یا مہری سے تھوڑا سا تیل لا دیتی۔ پر کل میرا دل بے چین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ میری بہن ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کامل ایک گھنٹہ تک اس کے سر پر تیل ملتی رہی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت مجھے کتنا روحانی لطف آ رہا تھا۔ میرا دل خود بخود کسی زبردست کشش کے تابع ہو کر اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ میری نند نے آ کر میرے اس فعل پر کس قدر ناک بھوں چڑھائی، تیور بدلے مگر میں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ آج علی الصبح سخت سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں سلے جاتے تھے۔

مہری کام کرنے اٹھی تو کھڑی کانپ رہی تھی۔ میں لحاف اوڑھے انگیٹھی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس پر بھی منہ کھولنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ مہری کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھے اپنی خود غرضی پر شرم آئی۔ میں نے خیال کیا جو یہ ہے وہی میں ہوں۔ اس کی روح میں بھی وہی روشنی ہے۔ لیکن میں آرام سے انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوں اور یہ میری خدمت میں مصروف۔ یہ نااتفاقی کیوں؟ کیا اس وجہ سے کہ میں ایک دولت مند شخص کی بیوی ہوں؟ کیا اس وجہ سے کہ خودی نے ہماری نگاہوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ مجھے کچھ سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فوراً اٹھی اور نیا شال لاکر مہری کو اڑھا دیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا۔ اس نے متعجب ہوکر کہا "بھوجی چھوڑیئے میں کردوں۔ سرکار کو کچہری جانے میں دیر ہو جائے گی"

میں نے لحاف اتار دیا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر برتن دھونے لگی۔ غریب عورت مجھے بار بار ہٹانا چاہتی تھی۔ میری نند نے آکر مجھے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا اور اس طرح منہ بنا کر چلی گئی گویا میں کوئی سوانگ بھر رہی ہوں۔ تمام گھر میں ہلچل مچ گئی۔ گویا کوئی تعجب خیز واقعہ ہو گیا۔ ہم کتنے خود پرست ہیں۔ ہم پرماتما کی توہین کرتے ہیں۔ نفسانیت کے دام میں پھنس کر اپنے ہی اوپر انواع واقسام کے ظلم کرتے ہیں۔ افسوس!

شوہر

شاید میانہ روی عورتوں کی سرشت میں داخل ہی نہیں۔ وہ حد ذیر ہی رہ سکتی ہیں۔ پرمدا کہاں تو اپنی عالی نسبی پر جان دیتی تھی، قومی وقار کا راگ الاپتی تھی۔ کہاں اب مساوات در ہمہ اوست کی صورت بنی بیٹھی ہے۔ میری ذرا سی تعلیم کا یہ اثر ہے۔ اب میں بھی اپنی قوت تالیف پر ناز کروں گا۔ واقعی یہ جنس تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اس میں مجھے اعتراض نہیں ہے کہ وہ نیچی ذاتوں کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے، ہنسے بولے، انھیں پڑھ کر کچھ سنائے لیکن ان کے پیچھے اپنے آپ کو بالکل کھو دینا میں کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

تین دن ہوئے میرے پاس ایک چمار اپنے زمیندار کے مظالم کا رونا رونے آیا۔

بیشک زمیندار نے اس کے ساتھ سختی برتی تھی۔ لیکن وکیل مفت میں تو مقدمہ نہیں کیا کرتا اور پھر ایک چمار کے پیچھے ایک بڑے زمیندار سے دشمنی کروں۔ ایسا کروں تو پھر وکالت کر چکا۔ اس کی فریاد کی آواز برندا کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ میرے درپے ہوئی کہ اس مقدمہ کی پیروی ضرور کیجیے اور لگی بحث مباحثہ کرنے۔ میں نے حیلہ حوالہ کر کے اسے کسی طرح ٹالنا چاہا لیکن اس نے مجھ سے وکالت نامہ پر دستخط بنوا ہی لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تین دنوں میں میرے پاس کئی مقدمے ایسے ہی مفت خوروں کے آئے اور مجھے کئی بار برندا کو سخت الفاظ میں فہمائش کرنی پڑی۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے عورتوں کو مذہبی مسائل کی تلقین کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہر ایک اصول کی عملی شان کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں ہیں کہ خدا عادل ہے پر اس کی عدالت کے پیچھے اپنے ماحول کو کوئی نہیں بھولتا۔ اگر وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر عمل کیا جائے تو تمام دنیا میں آج امن و عافیت کی دہائی پھر جائے۔ لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کا ایک اصول ہی رہے گا اور انسانی قوت ہمارے نظام معاشری کی ایک محال تمنا۔ ہم ان دنوں مسائل کی زبان سے تعریف کرتے ہیں۔ ان پر مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ عوام کی نظروں میں وقار حاصل کرنے کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ برندا اتنی ذرا سی معمولی اور موٹی بات بھی نہیں سمجھتی۔

برندا کا انہماک روز بروز ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے۔ آج سب کے کھانے کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنا ہے۔ اب تک گھر کے خاص آدمیوں کے لیے باریک چاول پکتے تھے۔ ترکاریاں گھی میں بنائی جاتی تھیں۔ دودھ مکھن اور میوہ جات وغیرہ منگوائے جاتے تھے۔ نوکروں کے لیے موٹا چاول، تیل کی ترکاری، مٹر کی دال رہتی تھی۔ دودھ وغیرہ انھیں نہیں دیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں بھی یہی دستور زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے اور نہ نوکروں نے اس کے متعلق کبھی شکایت کی۔ لیکن آج ملازموں نے بھی وہی کھانے کھائے ہیں جو گھر کے لوگوں نے کھائے۔ میں کچھ بول نہ سکا۔ متحیر سا ہو گیا۔

برندا خیال کرتی ہے کہ کھانے میں فرق کرنا نوکروں پر ظلم ہے۔ کتنا بچوں کا سا خیال ہے۔ یہ اپنی مساوات کی دھن میں شریف رذیل، چھوٹے بڑے کا فرق مٹانا چاہتی ہے۔ اے بیوقوف یہ تفریق ہمیشہ قایم رہتی ہے اور رہے گی۔ میں بھی ملکی اتحاد کا حامی ہوں اور تمام تعلیم یافتہ ابنائے وطن اس اتحاد پر جان دیتے ہیں لیکن کوئی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ ان مزدوروں، خدمت گاروں کو برابری کا حق دیا جائے۔ ہم ان میں تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں ان کو حالتِ افلاس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ ہوا تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ پر اس کی اصلیت کیا ہے یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں خواہ اس کا اظہار نہ کیا جاوے اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ ہمارا ملکی وقار قایم ہو، ہمارا دائرۂ اثر وسیع ہو، ہم اپنے حقوق کے لیے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کر سکیں، ہمیں یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ ہماری آواز صرف تعلیم یافتوں کی آواز نہیں ہے بلکہ تمام قوم کی متحدہ آواز ہے لیکن یہ برندا اتنا بھی نہیں سمجھتی۔

بیوی

کل میرے شوہر کا منشا ظاہر ہوا۔ اس وقت میری طبیعت سخت مغموم ہوئی۔ اے خدا دنیا میں اتنی نمائش ہے۔ لوگ اتنے خود غرض ہیں، اتنے ظالم ہیں۔ مجھے کل یہ دردناک تجربہ ہوا۔ میں اس نصیحت کو سن کر اپنے شوہر کو دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا فخر تھا کہ ایسے نفس مطمئنہ کی خدمت گذاری کا موقع حاصل ہے۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ جو لوگ دوناؤں پر ایک ساتھ بیٹھنے کے مشتاق ہیں زیادہ تر وہی قومی خیر اندیش کہلاتے ہیں۔

کل میری نند کی رخصتی تھی۔ وہ سسرال جا رہی تھی۔ شہر کی بہتیری عورتیں آئی تھیں۔ وہ سب عمدہ لباس اور مرصع زیورات سے آراستہ ہو کر قالینوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں ان کی مہمان داری میں مصروف تھی کہ یکایک مجھے دروازے پر چند عورتیں اس جگہ زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں جہاں ان عورتوں کی سلیپریں اور جوتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بیچاریاں

بھی رخصتی دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے ان کا وہاں بیٹھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لیے میں نے ان کو بھی لاکر قالین پر بٹھا دیا۔ اس پر ان خاتونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور تھوڑے عرصے میں سب کی سب کسی نہ کسی حیلے سے ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ اتنے میں کسی نے میرے شوہر تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ باہر سے نہایت مغلوب القلب ہو کر آئے اور بھری سبھا میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

آج علی الصبح اٹھی تو میں نے عجیب واقعہ دیکھا۔ شب میں مہمانوں کی دعوت و مدارات کے بعد جو جوٹھے پتل، کٹورے، دونے وغیرہ باہر میدان میں پھینک دیے گئے تھے اس وقت پچاسوں آدمی انھیں پتلوں پر گرے ہوئے ان کو چاٹ رہے تھے۔ ہاں انسان تھے اور انسان وہی انسان جن پر پرماتما کا جلوہ ہے۔ روشنی ہے۔ بہتیرے کتے بھی ان پتلوں پر جھپٹ رہے تھے۔ پر یہ کنگلے کتوں کو مار کر ہٹا دیتے تھے۔ ان کی حالت کتوں سے بھی گئی گذری تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ ایشور! یہ بھی ہمارے بھائی بہن ہیں۔ ہماری ہی روحیں ہیں۔ ان کی ایسی قابل رحم حالت! میں نے اسی وقت مہری کو بھیج کر ان آدمیوں کو بلایا اور سیوے مٹھائیاں وغیرہ جو مہمانوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں سب کی سب پتلوں میں رکھ انھیں دے دیں۔ مہری تھرانے لگی کہ مالک سنیں گے تو میرے سر کا ایک بال نہ چھوڑیں گے۔ لیکن میں نے اسے ڈھارس دی تب اس کی جان میں جان آئی۔

ابھی یہ بیچارے مٹھائیاں کھا ہی رہے تھے کہ میرے شوہر صاحب بھی غصہ میں بھرے ہوئے آئے اور نہایت سخت آواز میں بولے "تمھاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گیا ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک آفت مچائے رہتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ مٹھائیاں ڈومڑوں کے لیے نہیں بنوائی گئی تھیں، مہمانوں کے لیے بنوائی گئی تھیں۔ اب مہمانوں کو کیا دیا جائے گا؟ کیا تم نے میری غیرت کو خاک میں ملانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے؟"

میں نے مستقل مزاجی سے کہا "آپ فضول غصہ کرتے ہیں۔ آپ کی جس قدر مٹھائیاں میں نے خرچ کی ہیں وہ سب منگا دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی شخص تو مٹھائیاں کھائے اور کوئی پتل اور دونے چاٹے۔ ڈومڑے بھی تو انسان ہیں۔ ان کی بھی تو روح وہی ہے۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟"

شوہر صاحب بولے "رہنے بھی دو۔ بے وقت کی شہنائی بجاتی ہو۔ جب دیکھو وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ سب روحیں ایک سی ہیں۔ اگر ایک سی ہیں تو ایشور کو کس نے منع کر دیا تھا کہ سب کو ایک حالت میں نہ رکھے۔ اس اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق اس نے کیوں کر رکھی ہے۔ بے سر پیر کی بحث کرتی ہو۔"

میں خاموش ہوگئی۔ بول نہ سکی۔ میرے دل سے شوہر کی عزت اور محبت اٹھنے لگی۔ افسوس نفسانیت نے ہم کو کس قدر خود غرض بنا دیا ہے۔ ہم ایشور کا بھی سوانگ بھرتے ہیں۔ کتنی شرمناک ریاکاری ہے۔ ہم حقیقت کو مکمل مفاد اور ذاتی اغراض پر قربان کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوتیں تو تعجب کیا ہے۔

بوڑھی کاکی

(۱)

بڑھاپا اکثر بچپن کا دور ثانی ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں ذائقہ کے سوا کوئی حس باقی نہ تھی اور نہ اپنی شکایتوں کی طرف مخاطب کرنے کا رونے کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ آنکھیں، ہاتھ، پیر سب جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے۔ کھانے کا وقت ٹل جاتا یا مقدار کافی نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انھیں نہ ملتی تو رونے لگتی تھیں اور ان کا رونا محض بسورنا نہ تھا۔ وہ بہ آواز بلند روتی تھیں۔ ان کے شوہر کو مرے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا۔ سات بیٹے جوان ہو ہو کر داغ دے گئے اور اب ایک بھتیجے کے سوا دنیا میں ان کا اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انھوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت تو خوب لمبے چوڑے وعدے کیے لیکن وہ وعدے صرف قلی ڈپو کے دلالوں کے سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ دو سو روپے سالانہ سے کم نہ تھی لیکن بوڑھی کاکی کو اب پیٹ بھر روکھا دانہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔ بدھ رام طبیعت کے نیک آدمی تھے۔ لیکن اسی وقت تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا طبیعت کی تیز تھی لیکن ایشور سے ڈرتی تھی، اس لیے بوڑھی کاکی پر اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی جتنی بدھ رام کی نیکی۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنی بے انصافی کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتے کہ اس جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا آدمی بنا بیٹھا ہوں اور اگر زبانی تسکین یا تشفی سے صورت حال میں کچھ اصلاح ہو سکتی تو انھیں مطلق دریغ نہ ہوتا۔ لیکن مزید خرچ کا خوف ان کی نیکی کو دبائے رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر دروازہ پر کوئی بھلا مانس بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اپنا نغمہ بے ہنگام شروع کر دیتیں تو وہ آگ ہو جاتے تھے اور گھر میں آکر انھیں زور سے ڈانٹتے تھے۔ لڑکے جنھیں بڑھوں سے ایک بغض للہ ہوتا ہے، والدین کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور بھی دق کرتے۔ کوئی چٹکی لے کر بھاگتا، کوئی ان پر پانی کی کلی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ تو شہد ہی تھا کہ وہ صرف کھانے کے لیے روتی ہیں۔ اس لیے کوئی ان کے نالہ و فریاد پر دھیان نہ دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی کبھی غصہ میں آکر لڑکوں کو گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقع دار دات پر ضرور جاتی۔ اس خوف سے کاکی اپنی شمشیر زبانی کا شاذ ہی کبھی استعمال کرتی تھیں۔ حالانکہ رفع شر کی یہ تدبیر رونے سے زیادہ کارگر تھی۔

سارے گھر میں اگر کسی کو کاکی سے محبت تھی تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ یہی اس کا ملجا تھا۔ اور اگرچہ کاکی کی پناہ ان کی معاندانہ سرگرمی کے باعث بہت گراں پڑتی تھی لیکن بھائیوں کے دست تطاول سے بدرجہا قابل ترجیح تھی۔ اس مناسب اغراض نے ان دونوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچوں کا جم غفیر ٹکٹکی حیرت سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ چارپائیوں پر مہمان لیٹے ہوئے نائیوں سے ٹکیاں لگوا رہے تھے۔ قریب ہی ایک بھاٹ کھڑا کبت سنا رہا تھا اور بعض سخن فہم مہمانوں کی واہ واہ سے ایسا خوش ہوتا تھا گویا وہی اس داد کا مستحق ہے۔ دو ایک انگریزی پڑھے ہوئے نوجوان ان بیہودگیوں سے بیزار تھے۔ وہ اس دہقانی مجلس میں بولنا یا

شریک ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ آج بدھ رام کے بڑے لڑکے سکھ رام کا تلک آیا ہے۔ یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر میں مستورات تیاریاں کر رہی تھیں اور روپا مہمانوں کی دعوت کا سامان کرنے میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑاہ چڑھے ہوئے تھے۔ ایک میں پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسرے میں سموسے اور پیڑاکیں بنتی تھیں۔ ایک بڑے ہنڈے میں مصالحے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مصالحے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھی کاکی اپنی اندھیری کوٹھری میں خیالِ غم کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ لذت آمیز خوشبو انھیں بے تاب کر رہی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں شاید مجھے پوریاں نہ ملیں گی۔ اتنی دیر ہوگئی۔ کوئی کھانا لے کر نہیں آیا معلوم ہوتا ہے لوگ سب کھا گئے ہیں۔ میرے لیے کچھ نہ بچا۔ یہ سوچ کر انھیں بے اختیار رونا آیا۔ لیکن شگون کے خوف سے رو نہ سکیں۔

آہا! کیسی خوشبو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو ایسے نصیب کہاں کہ پوریاں پیٹ بھر ملیں۔ یہ سوچ کر انھیں پھر بے اختیار رونا آیا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی لیکن روپا کے خوف سے انھوں نے پھر ضبط کیا۔

بوڑھی کاکی دیر تک انھیں افسوس ناک خیالوں میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مصالحے کی خوشبو رہ رہ کر دل کو آپے سے باہر کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کا ذائقہ یاد کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی "کسے پکاروں۔ آج لاڈلی بھی نہیں آئی۔ دونوں لونڈے روز دق کیا کرتے ہیں آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا کہ کیا بن رہا ہے"۔

بوڑھی کاکی کی چشم خیال میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی۔ خوب لال لال پھولی پھولی نرم نرم ہوں گی۔ روپا نے خوب مائن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آرہی ہوگی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑاہ کے سامنے ہی بیٹھوں پوریاں چھن چھن کر کے کڑاہ میں تیرتی ہوں گی۔ کڑاہ سے گرما گرم نکال کر کٹھولنے میں رکھی جاتی ہوں گی۔ پھول ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن سیر باغ کا کچھ اور ہی لطف ہے۔

اس طرح فیصلہ کر کے بوڑھی کاکی اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی بمشکل تمام چوکھٹ سے اتریں اور دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی کڑھاؤ کے پاس جا بیٹھی۔ روپا اس وقت ایک سراسیمگی کی حالت میں تھی۔ کبھی اس کمرے میں جاتی، کبھی اس کمرے میں، کبھی کڑاہ کے پاس، کبھی کوٹھے پر۔ کسی نے باہر سے آکر کہا "مہراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں"۔ ٹھنڈائی دینے لگی۔ اتنے میں پھر کسی نے آکر کہا۔ "بھاٹ آیا ہے۔ اسے کچھ دے دو"۔ بھاٹ کے لیے سدھا نکال رہی تھی کہ ایک تیسرے آدمی نے آکر پوچھا کہ ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول میرا اتار دو"۔ بیچاری اکیلی عورت چاروں طرف دوڑتے دوڑتے حیران ہو رہی تھی۔ جھنجھلاتی تھی۔ کڑھتی تھی۔ پر غصہ باہر نکلنے کا موقع نہ پاتا تھا۔ خوف ہوتا تھا۔ کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے ہی میں ابل پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا حلق سوکھا جاتا تھا۔ گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی لیکن اتنی فرصت کہاں کہ ذرا پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ذرا نگاہ پلٹی اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس کشمکش کے عالم میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑاہ کے پاس بیٹھے دیکھا تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا۔ یہ خیال نہ رہا کہ پڑوسنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ جیسے مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی اور انھیں دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر بولی۔ "ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے کہ آگ کا کنڈ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھتے کیا دم گھٹتا تھا۔ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا۔ دیوتاؤں کا بھوگ تک نہیں لگا۔ تب تک صبر نہ ہو سکا۔ آکر چھاتی پر سوار ہو گئیں۔ نوج ایسی جیبھ۔ دن بھر کھاتی نہ رہتیں تو نہ جانے کس کی ہانڈی میں منھ ڈالتیں۔ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ بڑھیا بھر پیٹ کھانے کو نہیں پاتی۔ تب ہی تو اس طرح بوکھلائی پھرتی ہے۔ (اس خیال سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا) ڈائن نہ مرے نہ ماچا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کے دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ لے بھلا چاہتی ہو تو جا کر کوٹھری میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ لگیں گے

تمھیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی تک نہ جائے لیکن پہلے ھاری پوجا کر دے۔

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی وہاں سے نے کمرے میں چلی گئیں۔ صدمہ ایسا سخت تھا کہ دل و دماغ کی ساری قوتیں، سارے جذبات اری حسیات اس طرف رجوع ہو گئی تھیں جیسے ندی میں جب کراڑ کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر ا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اس خلا کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

(۲)

کھانا تیار ہو گیا۔ آنگن میں پتّل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گانا شروع .مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اس جماعت کے ساتھ پر ذرا ہٹ کر کھانے بیٹھے ے تھے۔ لیکن آداب مجلس کے مطابق جب تک سب کے سب کھانہ چکیں کوئی اٹھ نہ سکتا ۔ وہ ایک مہمان جو ذرا تعلیم یافتہ تھے خدمت گاروں کی پُرخوری پر جھنجھلا رہے تھے۔ س قید کو بے معنی و مہمل سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھری میں جا کر پچتا رہی تھیں کہ کہاں سے کہاں گئی۔ انھیں رونا ہ نہیں تھا۔ اپنی عجلت پر افسوس تھا۔ سچ تو ہے جب تک مہمان لوگ کھانہ چکیں گے لے کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہ رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب تک کوئی نہ بلانے آئے گا نہ جاؤں گی۔

دل میں یہ فیصلہ کر کے وہ خموشی سے بلاوے کا انتظار کرنے لگیں لیکن گھی کی مرغوب بہت صبر آزما ثابت ہو رہی تھی۔ انھیں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھنٹہ معلوم ہوتا تھا۔ بچھ گئے ہوں گے۔ اب مہمان آ گئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ نائی رے رہا ہے معلوم ہوتا ہے لوگ کھانے پر بیٹھ گئے۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ نے کے لیے لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے ایک غنغنانے لگیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ مجھے

گاتے بہت دیر ہوگئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہیں ہوں گے۔ کسی کی بول چال سنائی نہیں دیتی۔ ضرور لوگ کھاپی کے چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی ہے۔ کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہو کہ آپ ہی آئیں گی۔ کوئی مہمان نہیں کہ بلاؤں۔

بوڑھی کاکی چلنے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ یقین کہ اب ایک لمحہ میں پوریاں اور مصالے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی ان کے حسن ذائقہ کو گدگدانے لگا۔ انھوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہوں گی۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا میں تو مانگ مانگ کر کھاؤں گی۔ یہی نہ لوگ کہیں گے انھیں لحاظ نہیں ہے۔ کیا کریں۔ اتنے دنوں کے بعد پوریاں مل رہی ہیں۔ تو منہ جھوٹا کر کے تھوڑے ہی اٹھ آؤں گی۔"

وہ اکڑ دبیٹھ کر ہاتھوں کے بل کھسکتی ہوئی آنگن میں آئیں۔ مگر وائے قسمت! اشتیاق نے اپنی پرانی عادت کے مطابق وقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔ مہمانوں کی جماعت ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا اور کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ بھی کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا کہ پتل پر پوریاں چھوٹی جاتی ہیں۔ کاش کسی طرح انھیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کے زبان چٹخارتا تھا لیکن دوسرا شکورا مانگتے ہوئے شرماتا تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے بیچ میں جا پہنچیں۔ کئی آدمی چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے آوازیں آئیں "ارے یہ کون بڑھیا ہے؟ دیکھ کسی کو چھو مت اے۔"

پنڈت بدھ رام کاکی کو دیکھتے ہی غصہ سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لیے کھڑے تھے تھال کو زمین پر پٹک دیا اور جس طرح بے رحم ساہوکار اپنے کسی نادہند مفرور اسامی کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹیٹوا لیتا ہے اسی طرح لپک کر انھوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں شانے پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انھیں اس اندھیری کوٹھری میں دھم سے گرا دیا۔ آرزوؤں کا سبز باغ لو کے ایک جھونکے میں ویران ہوگیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھایا۔ باجے والے، دھوبی، چمار بھی کھا چکے لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے نہ پوچھا۔ بدھ رام اور روپا دونوں ہی انھیں ان کی بے حیائی کی سزا دینے کا تصفیہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر، بے کسی پر، فتور عقل پر کسی کو ترس نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لیے کڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بہت انس تھا۔ بے چاری بھولی، سیدھی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہ تھی۔ دونوں بار جب اس کے ماں اور باپ نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا تو لاڈلی کا کلیجہ بیٹھ کر رہ گیا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی کہ یہ لوگ کاکی کو کیوں بہت سی پوریاں نہیں دے دیتے۔ کیا مہمان سب کی سب تھوڑے ہی کھا جائیں گے اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے ہی کھا لیا تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انھیں تشفی دینا چاہتی تھی لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں مطلق نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھیں۔ اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اماں غافل سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھی اور سوچنے لگی کہ کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولھوں میں آگ چمک رہی تھی۔ اور چولھوں کے پاس ایک کتا لیٹا ہوا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دم، ان کی گدا سب صاف نظر آتی تھی۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں کتا اٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہوئی۔ کئی سوتے ہوئے آدمیوں کی بہ نسبت ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لیے زیادہ تقویت

کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی اور بوڑھی کاکی کی کوٹھری کی طرف چلی۔

۲

بوڑھی کاکی کو محض اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے شانے پکڑے، پھر انھیں ایسا معلو ہوا جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لیے جاتا ہے۔ ان کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے۔ تب کسی نے انھیں پہاڑ پر سے پٹک دیا۔ وہ بے ہوش ہوگئیں۔

جب ان کے ہوش بجا ہوئے تو کسی کی ذرا بھی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں کہ سب لوگ کھا پی کر سو گئے اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی۔ رام! کیا کھاؤں پیٹ میں آگ جل رہی ہے۔ ہا! کسی نے میری سدھ نہ لی۔ کیا میرا ہی پیٹ کاٹنے سے دھن ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی دیا بھی نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے۔ اس کا دیا کیوں دکھائیں۔ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ۔ اس پر یہ حال۔ میں اندھی اپاہج ٹھیری۔ نہ کچھ سوجھے نہ بوجھے۔ اگر آنگن میں چلی گئی تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں۔ پھر آنا۔ مجھے گھسیٹا، پٹکا۔ انھیں پوریوں کے لیے را نے سب کے سامنے گالیاں دیں۔ انھیں پوریوں کے لیے اور اتنی درگت کر کے بھی ان پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا، میری بات نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دے گ یہ سوچ کر مایوسانہ صبر کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقت سے گلا بھر بھر آتا تھا لیکن مہمانوں کے لحاظ سے روتی نہ تھیں۔

یکایک ان کے کان میں آواز آئی: "کاکی اٹھو۔ میں پوریاں لائی ہوں۔"

کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچانی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی ٹٹولا اور اسے گود میں بٹھا لیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں۔ کاکی نے پوچھا۔

"کیا تمھاری اماں نے دی ہیں؟"

لاڈلی نے فخر سے کہا: "نہیں یہ میرے حصے کی ہیں۔"

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہوگئی۔ لاڈلی نے پوچھا۔ "کاکی پیٹ بھر گیا؟"

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی ہمس پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی اشتہا اور رغبت کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بولیں "نہیں بیٹی جاکے اماں سے اور مانگ لاؤ۔"

لاڈلی: اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی تو اماں ماریں گی۔"

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں چند ریزے گرے تھے۔ انھیں نکال کر کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں۔ چٹخارے بھرتی تھیں۔ دل مسوس رہا تھا کہ اور پوریاں کیسے پاؤں؟ صبر کا باندھ جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ مستوں کو سرور کی یاد دلانا انھیں دیوانہ بناتا ہے۔ کاکی کا بیتاب دل خواہش کے اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ حلال حرام کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر تک اس خواہش کو روکتی رہیں۔ یکایک لاڈلی سے بولیں۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔"

لاڈلی ان کا منشا نہ سمجھ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا اور انھیں لاکر جھوٹے پتلوں کے کے پاس بٹھا دیا اور غریب بھوک کی ماری فاترالعقل بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی۔ دہی کتنا لذیذ تھا۔ سالن کتنا مزہ دار، کچوریاں کتنی سلونی، سموسے کتنے خستہ اور نرم؟

کاکی فتورِ عقل کے باوجود جانتی تھیں کہ میں وہ کر رہی ہوں جو مجھے نہ کرنا چاہیے۔ میں دوسروں کے جھوٹے پتل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپے کی حرص مرض کا آخری دور ہے جب سارے حواس ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کا حسِ ذائقہ تھا۔

عین اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے۔ چونکی چارپائی کے ادھر ادھر تاکنے لگی کہ کہیں لڑکی نیچے تو نہیں گر پڑی۔ اسے وہاں نہ پاکر وہ اٹھ بیٹھی۔

تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جھوٹے پتلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کاکی پتلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی جو حالت ہوتی وہی اس وقت ہوئی۔ ایک برہمنی دوسروں کا جھوٹا پتل ٹٹولے اس سے عبرتناک نظارہ ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند لقموں کے لیے اس کی چھپری ساس ایسا رکیک اور حقیر فعل کر رہی ہے۔ یہ وہ نظارہ تھا جس سے دیکھنے والوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین رک گئی ہے۔ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی نئی آفت آنے والی ہے۔ روپا کو غصہ نہ آیا۔ عبرت کے سامنے غصہ کا ذکر کیا؟ درد اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس دھرم اور پاپ کا الزام کس پر ہے؟ اس نے صدق دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "پرماتما! میرے بچوں پر رحم کرنا۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دینا۔ ہمارا ستیاناس ہو جائے گا۔"

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی آج تک کبھی اتنی صفائی سے نظر نہ آئی تھی۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو روپے سال کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس کی یہ درگت اور میرے کارن۔ اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے، مجھے معاف کرو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشارے کی غلام بنی ہوئی تھی۔ اپنے نام کے لیے، اپنی بڑائی کے لیے سیکڑوں روپے خرچ کر دیے۔ لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے کھائے اسے اس تقریب کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ دے سکی۔ محض اس لیے نہ کہ وہ بڑھیا ہے۔ بے کس ہے۔ بے زبان ہے۔

اس نے چراغ جلایا۔ اپنے بھنڈارے کا دروازہ کھولا اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لیے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی۔

آدھی رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے ہوئے فرشتے بہشتی نعمتیں سجا رہے تھے۔ لیکن ان میں کسی کو وہ مسرت نہ حاصل ہو سکتی تھی۔ جو

بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر ہوئی۔ روپا نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔

"کاکی اٹھو کھانا کھالو۔ مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی۔ اس کا برا نہ ماننا۔ پرماتما سے دعا کرو کہ وہ میری خطا معاف کردے۔"

بھولے بھالے بچے کی طرح جو مٹھائیاں پاکر مار اور گھڑکیاں سب بھول جاتا ہے بوڑھی کاکی بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک روئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں اور روپا بیٹھی یہ روحانی نظارہ دیکھ رہی تھی۔

شطرنج کی بازی

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ امور سیاست میں، شعر و سخن میں، طرز معاشرت میں، صنعت و حرفت میں، تجارت و تبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکین سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعراء بوسہ و کنار میں مست، اہل حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں، اہل سیف تیتر بازی میں، اہل روزگار، سرمہ مسی، عطر و تیل کی خرید و فروخت کا دلدادہ۔ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے علم و حکمت کی کن کن ایجادوں میں مصروف ہے۔ بر و بحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی تھیں۔ کہیں چوسر ہو رہی ہے۔ پو بارہ کا شور مچا ہوا ہے۔ کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ ہاں گتوں اور رتالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے لیے نئے نئے نقشے اور نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک

اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ارباب نشاط سے تلمذ کرتے تھے۔ فکر کو جولاں، عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انھیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکرِ معاش سے آزاد تھے۔ آخر کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے پھر انھیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوئی، کب سہ پہر اور کب شام۔ گھر سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں دسترخوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انھیں کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے ہرگز نہیں۔ محلہ کے گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں، ماماؤں میں بڑی حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے۔ گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے نہ دنیا کے کام کا۔ بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو گھر کا نہ گھاٹ کا۔ برا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کبھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالاں کہ انھیں اس کے مواقع مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی ہی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سو جاتی تھیں تب کہیں

مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جو لاہے کا غصہ داڑھی پر اتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں۔ کہہ دو آکر لے جائیں۔ کیا باؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جاکر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ انھیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو، نگاڑ، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا تو ماما سے کہا جاکر مرزا جی کو بلا لو۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لادیں۔ دوڑ جلدی کر۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی تو مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جاکر کہہ کہ ابھی چلیے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ مجھے ان کے آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتیوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے، ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب چھومنتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر رفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا "ارے جاکر سن ہی آیئے نا۔ عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں"۔

مرزا: جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتیوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔

میر صاحب: جی، اس بھروسے نہ رہیے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے کے دھرے رہ جائیں اور مات ہو جائے۔ پر جائیے سن آیئے کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھائیے گا۔

مرزا جی: جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔

میر صاحب : میں کھیلوں گا ہی نہیں ۔ آپ پہلے جا کر سن آئیں ۔

مرزا جی : ارے یار جانا پڑے گا حکیم کے یہاں ۔ درد ورد خاک نہیں ہے ۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ۔ ہے ۔

میر صاحب : کچھ بھی ہو ، ان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی ۔

مرزا جی : اچھا ، ایک چال اور چل لوں ۔

میر صاحب : ہرگز نہیں ۔ جب تک آپ سن نہ آئیں گے مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا ۔

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا ۔ تمھیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے پر اٹھنے کا نام بھی نہیں لیتے ۔ شطرنج ہے کہ میری سوتن ہے ۔ نوج کوئی تم جیسا نر موہیا ہو ۔

مرزا : کیا کروں ۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے ۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں ۔

بیگم : کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں ۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کر دیا ۔

مرزا : بڑا لتی آدمی ہے ۔ جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے ۔

بیگم : دھتکار کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح ۔

مرزا : سبحان اللہ ! برابر کے آدمی ہیں ۔ عمر میں رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے ۔ ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے ۔

بیگم : تو میں ہی دھتکارے دیتی ہوں ۔ ناراض ہو جائیں گے ۔ کرن میری روٹیاں چلاتے ہیں ۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی (ماما سے) عباسی شطرنج اٹھالا ۔ میر صاحب سے کہہ دینا میاں اب نہ کھیلیں گے ۔ آپ تشریف لے جائیں ۔ اب پھر منھ نہ دکھائیے گا ۔

مرزا : ہائیں ہائیں ۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا ۔ کیا ذلیل کرائے گی ۔ ٹھہر عباسی کمبخت کہاں

دوڑی جاتی ہے۔

بیگم: جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا ہی خون پیئے جو روکے، اچھا اسے روک لیا۔ مجھے روک لو تو جانوں۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود جھلائی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لیے، تمھیں، شہید کربلا کی قسم۔ میری میت دیکھے جو ادھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی۔ دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رک گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا۔ حسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسب ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیئے تھے اور اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیئے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اندر پہنچ کر بازی الٹ دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے، کچھ باہر۔ تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی، مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو سمجھ گئے کہ بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا "تم نے غضب کر دیا!"

بیگم: اب موا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلا سمجھ لیا ہے۔ اتنی لو اگر خدا سے ہو تو ولی ہو جائے۔ آپ لوگ شطرنج کھیلیں۔ میں یہاں چولہے چکی میں سر کھپاؤں۔ لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے تو معذرت آمیز لہجہ میں بادلِ پُر درد سارا ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے "اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب دردسر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اف! اتنی تمکنت! آپ نے انھیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے

ہیں ۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے ۔ مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انھیں کیا مجال ۔ میرے یہاں دیکھیے کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا ۔

مرزا : خیر اب یہ بتائیے اب کہاں جماؤ ہوگا ؟

میر : اس کا کیا غم ہے ۔ اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے بس یہیں جمے گی ۔

مرزا : لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا ۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا تب تو اتنی خفگی تھی ۔ گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں ۔

میر : اجی بکنے دیجیے ۔ دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی ۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جائیے ۔

(۲)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں اس لیے وہ ان کے مشغلۂ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں بلکہ کبھی کبھی انھیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ اساتے تو سرد و بستاں یاد دہندن کے مصداق انھیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں ۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں ۔ لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج پیدا ہونے لگا تو انھیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی ۔ دن کے دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں ۔ سوچنے لگیں کیوں کر یہ بلا سر سے ٹلے ۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی ۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے ۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار ۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا ۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی ۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا ، کبھی پانی لانے کا ۔ کبھی برف لانے کا ، کبھی تمباکو بھرنے کا ۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا ۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے ۔ حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا ۔ دن بھر

دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پیچھے محلّے کے محلّے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلے والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں۔ مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کیا کروں میرا کیا بس ہے۔

محلہ میں دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے۔ وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی۔ پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھنچی چلی آتی تھی اور یہاں سامان عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ، نقال، کتنک، ارباب نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دوکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ معارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی۔ یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا، دھمکیاں دیتا مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر۔ میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گذر گئے۔ نت نئے نقشے حل کیے جاتے۔ نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے۔ کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی۔ تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی پر یہ تکرار رنجیاں بہت جلد رفع ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے، میر صاحب بساط اٹھا کر

اپنے گھر میں آ بیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آپہنچا۔ میر صاحب کے حواس اڑے، اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی، گھر کے دروازے بند کر لئے اور نوکروں سے کہا۔ گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔

خدمت گار: میں یہ نہیں جانتا۔ گھر میں سے یہی جواب ملا ہے۔ کیا کام ہے؟

سوار: کام تجھے کیا بتاؤں حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لئے کچھ سپاہی مانگے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہیں۔

خدمت گار: اچھا تشریف لے جائیے۔ کہہ دیا جائے گا۔

سوار: کہنے سننے کی بات نہیں۔ میں کل پھر آؤں گا اور تلاش کر کے لے جاؤں گا۔ اپنے ہمراہ۔ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے "اب کیا ہو گا؟"

مرزا: بڑی مصیبت ہے۔ کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر: کمبخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا: تہر آسمانی ہے اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہو تو بن موت مرے۔ یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی نپ چڑھ جاتی ہے۔

میر: یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھئے۔

مرزا: بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملئے ہی نہیں۔ دونوں آدمی غائب ہو جائیں۔

سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہوگی۔ حضرت آکر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جائیں گے۔

میر: بس، بس۔ آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں: "تم نے خوب بہروپ بھرا۔"

اس نے جواب دیا: "ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکی پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے۔ صبح کا گیا پھر رات کو آئے گا۔

(۳)

اس دن دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے، ڈبے میں گلوریاں بھرے گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جا بیٹھے جو شاید عہد مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم، تمباکو، مدر یار لے لیتے اور مسجد میں پہنچ، دری بچھا، حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انھیں دین و دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت شہ پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کوئی چلّہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دوکان پر کھانا کھا لیتے اور چلم حقہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انھیں کھانے کی سدھ بھی نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے شطرنج باز دوستوں کو نہ غم زرد اور نہ غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے۔ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔

مرزا صاحب انھیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی جال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب: انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔

مرزا: آنے دیجئے۔ کشت بچائیے۔ یہ کشت۔

میر: ذرا دیکھنا چاہئے۔ آڑے دیکھیں۔ کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔ دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مرزا: دیکھ لیجئے گا۔ کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر: توپ خانہ بھی ہے۔ کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ سرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مرزا: جناب حیلے نہ کیجئے۔ یہ کشت۔

میر: آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجئے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا تو گھر کیسے چلیں گے۔

مرزا: جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات!

فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے "آج کھانے کی کیسی رہے گی۔

میر: آج روزہ ہے۔ کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟

مرزا: جی نہیں۔ شہر میں نامعلوم کیا ہو رہا ہوگا؟

میر: شہر میں کچھ نہیں ہو رہا ہوگا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے۔ حضور جانعالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو۔

اب کی دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اسی اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیئے گئے تھے

اور فوج انھیں گرفتار کئے لئے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا، نہ کشت و خون۔ یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے۔ بیگمیں روئیں، مامائیں مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ازل سے کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسا جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرمانروا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا "حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔

میر: ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجئے شہ۔

مرزا: حضرت ذرا ٹھہریئے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے لکھنؤ کا چراغ آج گل ہوگیا۔

میر: رونا ہی چاہئیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ۔

مرزا: کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت میں ہے۔ بلائے آسمانی۔

میر: ہاں ہے ہی۔ پھر کشت۔ بس دوسری کشت میں مات ہے۔ بچ نہیں سکتے۔

مرزا: آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا ہائے حضور جان عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدردان نہیں رہا۔ لکھنؤ ویران ہوگیا۔

میر: پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے۔ پھر حضور پرنور کا ماتم کیجئے۔ یہ کشت اور مات لانا ہاتھ۔

نواب کو لئے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی۔ ہار کی چوٹ بری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا "آئیے اب صاحب کی حالت زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب

ہوگئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لئے بے صبر ہو رہے تھے۔

(۴)

شام ہوگئی۔ مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کر دی۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں۔ پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا وہ خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے، خوب سنبھل سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی۔ ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے ٹھمریاں گاتے تھے۔ چٹکیاں لیتے تھے۔ آوازے کستے تھے، غلام اور جگت میں کمال دکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے گویا دفینہ ہاتھ آگیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فعلیاں سن سن کر جھنجھلاتے تھے اور بار بار بوری چڑھا کر کہتے آپ چال نہ تبدیل کیا کیجئے۔ یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجئے۔ جناب آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھتے ہیں۔ میرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجئے۔ جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجئے۔ حضرت آپ کی چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں۔ اس کی مات سمجھی جائے۔ پھر آپ نے چال بدلی۔ مہرہ وہیں رکھ دیجئے۔

میر صاحب کا فرزیں پٹا جاتا تھا۔ بولے "میں نے چال چلی کب تھی؟"

مرزا: آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے۔

میر: اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا؟

مرزا: آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر: دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے

کوئی نہیں جیتتا۔

مرزا: یہ بازی آپ کی مات ہوگئی۔

میر: میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا: تو آپ مہرے اس گھر میں رکھ دیجئے۔ جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر: وہاں کیوں رکھوں؟ نہیں رکھتا۔

مرزا: آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر: ہرگز نہیں۔

مرزا: رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنی ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشا ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

مرزا جی نے فرمایا "اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھاس چھیلا کئے آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر: گھاس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گذر گئیں۔

مرزا: اجی جائیے! نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گذر گئی اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر: کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا: بے حیاؤں کو شرم کبھی نہیں آتی۔

میر: زبان سنبھالئے۔ ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔

آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا ملا ہوا ہاتھ۔ بھنڈار کھل گیا۔

مرزا: آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے۔ ادھر یا ادھر۔

میر: ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے؟

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکال لیں۔ ان دنوں ادنیٰ اور اعلیٰ سبھی کٹار، خنجر، پیش قبض، شیر پنجہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لئے، سلطنت کے لئے، قوم کے لئے کیوں مریں، کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا بلکہ وہ قومی ہو گئے تھے۔ دونوں نے پینترے بدلے۔ لکڑی اور گنکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں، چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لئے۔ جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انھیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لئے اپنی گردنیں لٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے۔ اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

سُجان بھگت

سیدھے سادھے کسان روپیہ ہاتھ میں آتے ہی دھرم اور شہرت کی طرف جھکتے ہیں۔ امیر لوگوں کی طرح پہلے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی طرف نہیں دوڑتے۔ سجان کی کھیتی میں کئی برس سے ہن برس رہا تھا۔ محنت تو گاؤں کے سبھی کسان کرتے ہیں لیکن اس کا ستارہ اوج پر تھا۔ بنجر زمین میں دانہ بوتا تو کچھ نہ کچھ پیدا ہو ہی جاتا۔ تین برس لگاتار ایکھ لگتی گئی۔ ادھر گڑ کا بھاؤ تیز تھا۔ دو اڑھائی ہزار ہاتھ میں آ گئے بس ذہن کا جھکاؤ دھرم کی طرف ہوتا گیا۔ سادھو سنتوں کا خیر مقدم اور تعظیم ہونے لگی۔ دروازے پر دھونی جلنے لگی۔ قانون گو علاقہ میں آتے تو سوجان مہتو کے یہاں ٹھیرتے۔ حلقے کا کانسٹبل، تھانیدار، محکمہ تعلیم کے افسر ایک نہ ایک ان کے چوپال میں پڑا ہی رہتا۔ مہتو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے۔ خوش بختی ان کے ہاں اتنے بڑے بڑے آدمی آکر ٹھیرتے تھے۔ جن حاکموں کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی تھی۔ انہی کی زبان اب مہتو! مہتو! کہتے سوکھتی تھی۔ ایک مہاتما نے فضا اچھی دیکھی تو وہیں آسن جما دیا۔ گانجہ اور چرس کی بہار اڑنے لگی۔ ایک ڈھولک آئی، منجرے منگوائے گئے اور ست سنگ ہونے لگا۔ یہ سب سوجان کے دم سے ہی تھا۔ گھر میں سیروں دودھ ہوتا لیکن سوجان کے منہ میں ایک بوند جاتی بھی حرام تھی۔ کبھی حاکم لوگ چکھتے اور کبھی سادھو۔ کسان کو دودھ گھی سے مطلب؟ اسے تو ساگ روٹی چاہئے۔ سوجان کی عاجزی کی انتہا نہ رہی۔

کے سامنے سر جھکائے رہتا۔ ایسا نہ ہو لوگ کہنے لگیں کہ دولت پاکر مغرور ہو گیا ہے۔ گاؤں میں کل تین ہی کنوئیں تھے۔ سبھی کھیتوں میں پانی نہ پہنچتا تھا۔ کھیتی ماری جاتی تھی۔ سوجان نے ایک پختہ کنواں اور بنوا دیا۔ کنویں کے بیاہ، برہم بھوج اور یگیہ ہوا۔ جس دن کنواں چلا اس روز جیسے سوجان کو دنیا بھر کی نعمتیں مل گئیں۔ جو کام گاؤں بھر میں کسی سے نہ ہوا تھا وہ باپ دادا کی عنایت سے سوجان نے کر دکھایا۔

ایک روز گاؤں میں گیا کے یاتری آکر ٹھیرے۔ سوجان ہی کے ہاں ان کا بھوجن ہوا۔ سوجان کے دل میں بھی گیا جانے کی بہت روز سے خواہش تھی۔ یہ اچھا موقع پاکر وہ بھی چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس کی بیوی بلاقی نے کہا "ابھی رہنے دو۔ اگلے سال چلیں گے۔"

سوجان نے متانت سے جواب دیا۔ "اگلے برس کیا ہوگا۔ کون جانتا ہے؟ دھرم کے کام میں میخ نکالنا اچھا نہیں ہوتا۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟"

"ہاتھ خالی ہو جائے گا۔"

"بھگوان کی اچھا ہوگی تو روپیہ پھر آجائے گا۔ ان کے ہاں کس بات کی کمی ہے؟"

بلاقی اس کا کیا جواب دیتی۔ مذہبی فریضہ میں مداخلت کرکے اپنی عاقبت کیوں بگاڑتی؛ صبح ہی خاوند اور بیوی گیا کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹے تو یگیہ اور برہم بھوج کی ٹھیری۔ ساری برادری کو مدعو کیا گیا۔ گیارہ گاؤں میں سپاریاں بٹیں۔ اس کر دفر سے کام ہوا کہ چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ سب یہی کہتے تھے کہ بھگوان دولت دے تو دل بھی ایسا ہی دے۔ گھمنڈ تو چھو بھی نہیں گیا۔ اپنے ہاتھ سے تیل اٹھاتا پھرتا ہے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا۔ بیٹا ہو تو ایسا ہو۔ باپ مرا تو گھر میں کوڑی بھی نہ تھی۔ اب لکشمی گھٹنے ٹیک کر آبیٹھی ہے۔

ایک حاسد نے کہا "کہیں گڑی ہوئی دولت مل گئی ہوگی۔" تو چاروں طرف سے اس پر لعنتیں برسنے لگیں۔ "ہاں تمہارے باپ دادا جو خزانہ چھوڑ گئے ہیں وہی اس کے ہاتھ لگ

گیا ہے۔" ارے بھیا! یہ دھرم کی کمائی ہے۔ تم بھی تو سینہ پھاڑ کر محنت کرتے ہو ایسی ایکھ کیوں نہیں ہوتی؟ بھگوان آدمی کا دل دیکھتے ہیں۔ جو خرچ کرنا جانتا ہے اس کو دیتے ہیں۔

(۲)

سوجان مہتو سوجان بھگت ہو گئے۔ بھگتوں کے طور اطوار کچھ اور ہی ہوتے ہیں بھگت بنا اشنان کئے کچھ نہیں کھاتے۔ گنگا اگر گھر سے دور ہو اور وہ دوپہر تک نہا کر لوٹ نہ سکتا ہو تو تہوار کے دن ضرور ہی وہاں جاتا ہے۔ بھجن اور پوجا تو اس کے گھر یقیناً ہونا چاہئے۔ پوجا پاٹھ اس کے لئے ازبس ضروری ہے۔ کھانے پینے میں بھی اسے خاص توجہ دینی پڑتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے جھوٹ ترک کرنا پڑتا ہے۔ بھگت غلط نہیں کہہ سکتا۔ عام آدمی کو اگر جھوٹ کی سزا ایک ملتی ہے تو بھگت کو ایک لاکھ سے کم نہیں۔ انجان کے لئے کتنے ہی قصور قابل معافی ہیں سیانے کے لئے نہ معافی ہے اور نہ کفارہ، اگر ہے بھی تو بہت مشکل۔ سوجان کو اب بھگت کا وقار قایم رکھنا پڑا۔ اب تک اس کی زندگی مزدور کی زندگی تھی۔ زندگی کا کوئی معیار کوئی اصول اس کے سامنے نہ تھا۔ اب اس کی زندگی میں خیالات آ گئے۔ راستہ کانٹوں سے بھرپور تھا۔ اپنی خدمت ہی پہلے اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس ترازو سے وہ ہر چیز کو تولتا تھا۔ وہ اب انھیں مناسب اور نامناسب کانٹوں پر تولنے لگا۔ یوں کہو کہ جیلی کی دنیا سے نکل کر اب وہ علم کی دنیا میں آ گیا۔ اس نے کچھ لین دین شروع کیا تھا۔ اب اسے بیاج لیتے ہوئے خجالت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ گوؤں کو دوہتے ہوئے اسے بچھڑوں کا خیال لگا رہتا۔ کہیں بچھڑا بھوکا تو نہیں رہتا؟ ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ کتنے ہی مقدموں میں اس نے جھوٹی شہادتیں دیں۔ کتنوں سے رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ اب ان کاموں سے اسے نفرت ہوتی تھی۔ جھوٹ اور ڈھونگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ پہلے اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مزدوروں سے جس قدر کام لیا جا سکتا ہے لے اور مزدوری جس قدر کم دی جا سکتی ہے، دے لیکن اب اسے کام سے زیادہ انسان کی مزدوری کی فکر ہوتی تھی۔ کہیں بے چارے

مزدوروں پر جبر نہ کریں بلکہ اس کی واحد فکر ہوتی تھی کہ کہیں کسی کاریاں نہ دیکھے۔ اس کے دونوں جوان بیٹے بات بات پر اس پر پھبتیاں کستے۔ یہاں تک کہ بلاقی بھی اب اسے کورا بھگت سمجھنے لگی۔ جسے گھر کے برے بھلے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ گیان کی دنیا میں آکر متو کورے بھگت ہو گئے۔

سوجان کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تمام حقوق چھینے جانے لگے۔ کس کھیت میں کیا بونا ہے، کس کا کیا دینا ہے، کیا لینا ہے، کس بھاؤ کیا چیز بکی۔ ایسی اہم باتوں میں بھگت جی کی صلاح نہ لی جاتی۔ بھگت کے پاس کوئی جانے ہی نہ پاتا۔ دونوں لڑکے یا خود بلاقی دور سے ہی معاملہ طے کر لیا کرتے۔ گاؤں بھر میں سوجان کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی اور خود اس کے گھر میں کم ہو رہی تھی۔ لڑکے اس کی عزت اب بہت کرتے۔ اسے خود چارپائی اٹھاتے دیکھ کر دور سے ہی لپک کر تھام لیتے۔ اسے چلم نہ بھرنے دیتے۔ یہاں تک کہ خود دھوتی تک نہ جھٹکنے دیتے۔ لیکن اثر اس کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ وہ اب گھر کا مالک نہیں، مندر کا دیوتا تھا۔

(۳)

ایک دن بلاقی اوکھلی میں دھان چھانٹ رہی تھی کہ ایک بھک منگا دروازہ پر آکر چلانے لگا۔ بلاقی نے سوچا دال بنالوں تو اسے دوں گی۔ اتنے میں بڑا لڑکا بھولا آکر بولا "اماں ایک مہاتما دروازے پر کھڑے گلا پھاڑ رہے ہیں، کچھ دے دو۔ ورنہ اس کا دل روئے گا۔"

بلاقی نے طنز سے کہا "بھگت کے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے؟ کیوں کچھ لے جا کر نہیں دے دیتے؟ کیا میرے چار ہاتھ ہیں؟ کس کس کا دل سکھی رکھوں؟ دن بھر تو تانتا بندھا رہتا ہے؟"

"چوپٹ کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور کیا؟ ابھی مہنگو بھینگی دینے آیا تھا۔ حساب سے سات من ہوتے تھے تولا تو پورے سات من نکلے۔ میں نے کہا دس سیر اور لا۔ تو آپ بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھے۔ اب اتنی دور کہاں لینے جائے گا۔ دو صراحی لکھ لو ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ میں نے

حساب بے باق نہیں لکھا۔ دس سیر باقی درج کر لئے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ بکنے دیا کرو انھیں۔ دس پانچ مرتبہ منھ کی کھائیں گے تو خود بخود بولنا چھوڑ دیں گے۔"

"دن بھر ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے ہی رہتے ہیں۔ سو مرتبہ کہہ دیا کہ تم گھر گرہستی کے معاملہ میں مت بولا کرو لیکن اس سے بنا بولے رہا ہی نہ جاتا۔"

"میں جانتی کہ ان کا یہ حال ہوگا تو گورو منتر نہ لینے دیتی۔"

"بھگت کیا ہوئے کہ دین دنیا سے گئے۔ تمام دن پوجا پاٹھ میں ہی اڑ جاتا ہے۔ ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہو گئے کہ کوئی کام ہی نہ کر سکیں۔"

بلاقی نے بات بدلی اور کہا۔" یہ تو تمھاری زیادتی ہے بھولا۔ اب بھلا ان سے بچھاڑا کدال کہاں پکڑا جاتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہیں۔ بیلوں کو دانہ پانی دیتے ہیں۔ گائے دوہاتے ہیں۔ اور بھی جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔"

فقیرا ابھی کھڑا چلا رہا تھا۔ سوجان نے جب گھر سے کسی کو کچھ بھی لاتے نہ دیکھا تو اٹھ کر اندر گیا اور کڑے لہجے میں بولا۔" تم لوگوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا کہ دروازہ پر کون گھنٹہ بھر سے کھڑا بھیک کے لئے چلا رہا ہے۔ اپنا کام تو دن بھر کرنا ہی ہے۔ ایک ساعت بھگوان کا کام بھی تو کر لیا کرو۔"

بلاقی بولی۔" تم تو بھگوان کا کام کرنے کے لئے بیٹھے ہی ہو۔ کیا گھر بھر یہی کام کرے

"کہیں آٹا رکھا ہے تو لاؤ۔ میں ہی نکال کر دے آؤں۔ تم رانی بنی بیٹھی رہو۔"

"آٹا میں نے مر مر کر پیسا ہے۔ اناج دے دو۔ ایسے مسٹنڈوں کے لئے پہر رات اٹھ کر چکی نہیں چلاتی ہوں۔"

سوجان گودام میں گئے اور ایک چھوٹی ٹوکری بھر جو لئے باہر نکلے جو سیر بھر سے

کیا کم ہوں گے۔ سوجان نے محض جان بوجھ کر بلاقی اور بھولا کو چڑانے کے لئے بھیک کی موزوں مقدار سے تجاوز کیا تھا۔ اس پر بھی یہ دکھانے کے لئے کہ ٹوکری میں زیادہ جو نہیں ہیں وہ اسے چٹکی سے تھامے ہوئے تھے۔ چٹکی اس قدر بوجھ نہ سنبھال سکتی تھی۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ایک لمحہ کی تاخیر ہونے سے ہی اس کے گر پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس لئے وہ جلدی سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ اچانک بھولا نے جھاڑی ان کے ہاتھ سے چھین لی اور تیور اکر کہا۔

"مال غنیمت نہیں ہے جو لٹانے چلے ہو۔ چھاتی پھاڑ پھاڑ کر کام کرتے ہیں تب گھر میں دانہ آتا ہے۔"

سوجان نے کھسیانہ ہو کر کہا "میں کبھی تو بیٹھا نہیں رہتا۔"

"بھیک، بھیک سمجھ کر دی جاتی ہے لٹائی نہیں جاتی۔ ہم تو ایک وقت کھا کر گزر کرتے ہیں کہ عزت بنی رہے اور تمہیں لٹانے کی سوجھی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

سوجان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر آکر بھکاری سے کہہ دیا "بابا! اس وقت جاؤ۔ گھر میں کسی کا ہاتھ خالی نہیں۔" اور خود پیڑ تلے جا کر خیالات میں ڈوب گیا۔ اپنے ہی گھر میں اس کی یہ قدر! ابھی وہ اپاہج نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ گھر کا کچھ نہ کچھ کام کرتا ہی ہوں۔ اس پر یہ توہین! اس نے یہ گھر بنایا۔ ساری رونق اسی کے دم خم سے ہے۔ لیکن اب اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں۔ اب وہ دروازہ کا کتا ہے۔ گھر والے جو روکھا سوکھا دے دیں وہ وہی کھا کر پیٹ بھر لے۔ اپنی زندگی پر لعنت ہے۔ سوجان ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

شام ہو گئی۔ بھولا کا چھوٹا بھائی شنکر چلم بھر کر لایا۔ سوجان نے دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے تمباکو جل گیا۔ ذرا دیر بعد بھولا نے دروازہ پر چارپائی ڈال دی۔ سوجان پیڑ تلے سے نہ اٹھا۔

کچھ دیر اور گذری۔ کھانا تیار ہوا۔ بھولا بلانے آیا۔ سوجان نے کہا: "بھوک نہیں ہے"۔ بہت منانے پر بھی نہ اٹھا۔ تب بلاقی نے آکر کہا: "کھانا کھانے کیوں نہیں چلتے۔ جی تو اچھا ہے"۔

سوجان کو سب سے زیادہ غصہ بلاقی پر ہی تھا۔ یہ بھی لڑکوں کے ساتھ ہے۔ یہ بیٹھی دیکھتی رہی اور بھولا نے اناج میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کے منہ سے اتنا بھی نہ نکلا کہ رہنے دے، لے جاتے ہیں تو لے جانے دے۔ لڑکوں کو نہ معلوم ہو کہ میں نے کتنی محنت سے یہ گرہستی بنائی ہے لیکن اسے تو معلوم تھا۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ بھادوں کی اندھیری راتوں میں لاٹھی تھامے جوار کی حفاظت کی ہے۔ جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں بھی دم نہیں لیا۔ اور اب گھر پر میرا اتنا بھی حق نہیں کہ کسی کو بھیک بھی دے سکوں۔ مانا کہ بھیک اتنی نہیں دی جاتی لیکن انھیں تو چپ رہنا چاہئے تھا خواہ میں گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگا دوں۔ قانون سے بھی تو میرا کچھ ہے۔ میں اپنا حصہ خود نہیں لیتا، دوسروں کو کھلا دیتا ہوں۔ اس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے۔ اب اس وقت منانے آئی ہے۔ اسے میں نے کبھی آج تک کنول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا۔ ورنہ ایسی کون عورت ہے گاؤں میں جس نے شوہر کی لاتیں نہ سہی ہوں۔ کبھی کڑی نگاہ سے دیکھا تک نہیں۔ روپے پیسے، لینا دینا سب اس کے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اب روپے جمع کر لئے ہیں تو مجھ سے ہی اکڑتی ہے۔ اب اسے لڑکے عزیز ہیں۔ میں تو گھر لٹاؤ، نکھٹو اور بھوندو ہوں۔ میری اسے کیا پروا۔ جب لڑکے نہ تھے تب میں گود میں اٹھا اٹھا کر وید کے پاس لئے پھرا تھا۔ آج اس کے بیٹے ہیں اور یہ ان کی ماں ہے۔ میں تو باہر کا آدمی ہوں۔ مجھنے گھر سے کیا مطلب؟ بولا۔

"میں اب کھا پی کر کیا کروں گا؟ ہل جوتنے سے رہا۔ بھاؤڑا چلا نہیں سکتا۔ مجھے کھلا کر اناج کو کیوں ضایع کرو گی؟ رکھ دو، بیٹا دوسری بار کھائے گا"۔

"تم تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو۔ سچ کہا ہے۔ بڑھاپے میں آدمی کی عقل

ماری جاتی ہے۔ بھولا نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ اتنی بھیک مت لے جاؤ یا اور کچھ؟"

"ہاں! بیچارہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ تمھیں تو تب مزا آتا اگر وہ اوپر سے دو چار ڈنڈے بھی جما دیتا۔ کیوں؟ اگر یہی خواہش ہے تو لو اب پوری کرو۔ بھولا کھا چکا ہوگا۔ اسے بلا لاؤ۔ نہیں۔ بھولا کو کیوں بلاتی ہو۔ تمھیں جماؤ نہ دو چار ہاتھ۔ اتنی کسر ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔"

"ہاں! اور کیا۔ یہی تو عورت کا فرض ہے۔ اپنے بھاگ سراہو کہ مجھ جیسی سیدھی عورت مل گئی۔ جس بل چاہتے ہو بٹھاتے ہو۔ ایسی منھ زور ہوتی تو گھر میں کیوں اب تک نباہ ہوتا۔"

"ہاں بھئی۔ وہ تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم دیوی تھیں اور ہو۔ میں تب بھی راکشش تھا اور اب تو شیطان ہوں۔ بیٹے کماؤ ہیں۔ ان کی سی نہ کہے گی تو اور کس کی کہے گی۔ مجھ سے اب کیا لینا دینا ہے؟"

تم جھگڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو اور میں بچانا چاہتی ہوں کہ چار آدمی ہنسیں گے۔ چل کر کھانا کھا لو سیدھے سے نہیں تو میں بھی جا کر سو رہوں گی۔"

"تم بھوکی کیوں سو رہو گی۔ تمھارے بیٹوں کی تو کمائی ہے۔ ہاں! میں تو بھلا اجنبی ہوں ہی۔"

"بیٹے تمھارے بھی تو ہیں۔"

"نہیں! میں ایسے بیٹوں سے باز آیا۔ کسی اور کے بیٹے ہوں گے۔ میرے بیٹے ہوتے تو کیا میری یہ درگت ہوتی؟"

"گالیاں دو گے تو میں کچھ اور کہہ بیٹھوں گی۔ سنتی تھی مرد بڑے تجربہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن تم سب سے نیارے ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ جیسا وقت دیکھے اس کے مطابق کام کرے۔ اب ہمارا اور تمھارا گذارہ اسی میں ہے کہ نام کے مالک بنے رہیں اور جو کچھ لڑکے چاہیں کریں۔ میں یہ بات سمجھ گئی تو تم کیوں نہیں سمجھتے۔ جو کماتا ہے اس کا گھر میں راج ہوتا ہے۔ یہی دنیا

کا دستور ہے۔ میں لڑکوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ تم کیوں اپنے من کی کرو۔ اتنے دن تو راج کر لیا۔ اب کیوں اس مایا میں پڑو، چلو کھانا کھالو۔"

"تو کیا میں دروازے کا کتا ہوں؟"

"بات جو تھی میں نے کہہ دی۔ اب خود کو جو چاہو سمجھو۔"

سوجان نہ اٹھے۔ بلاقی تھک ہار کر چلی گئی۔

(۴)

سوجان کے سامنے اب ایک نیا مسئلہ آکھڑا ہوا تھا۔ وہ بہت دنوں سے گھر کا مالک تھا اور اب بھی یہی تصور کرتا تھا۔ حالات میں کتنا الٹ پھیر ہو گیا اس کی اسے خبر نہ تھی۔ لڑکے اس کی عزت اور خدمت کرتے ہیں۔ اسی سے وہ مغالطہ میں پڑ گیا تھا۔ لڑکے اس کے سامنے چلم نہیں پیتے، کھاٹ پر نہیں بیٹھتے۔ کیا یہ سب اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ وہ محض عقیدت تھی۔ اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں۔ کیا عقیدت کے عوض وہ اپنا آقاپن کا حق چھوڑ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اب تک جس گھر میں راجہ تھا اس میں غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس گھر پر اب دوسروں کا غلبہ نہیں دیکھ سکتا۔ مندر کا پجاری ہو کر رہنا اسے قطعاً ناپسند تھا۔

نہ جانے کتنی رات باقی تھی کہ سوجان نے اٹھ کر گنڈاسے سے بیلوں کا چارہ کاٹنا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں سوتا تھا لیکن سوجان چارہ کاٹ رہے تھے۔ اتنی محنت اپنی زندگی میں انھوں نے کبھی نہ کی تھی۔ جب سے انھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، تب سے ہی چارہ کے لئے ہائے ہائے مچی رہتی تھی۔ شنکر بھی کاٹتا اور بھولا بھی لیکن چارہ پورا ہی نہ پڑتا آج وہ ان لونڈوں کو دکھا دے گا کہ چارہ کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جلد ہی ان کے سامنے کاٹے ہوئے چارہ کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ ٹکڑے کس قدر مہین اور صاف تھے جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔

منہ اندھیرے بلاقی اٹھی تو کٹے ہوئے چارہ کا ڈھیر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بولی۔
"یہ بھولا آج رات بھر چارہ ہی کاٹتا رہا۔ کتنا کہا کہ بیٹا جی سے جہان ہے۔ لیکن مانتا ہی نہیں۔ رات کو سویا ہی نہیں۔"
سوجان بھگت نے طنز سے کہا: "وہ سوتا ہی کب ہے؟ جب دیکھتا ہوں کام ہی کرتا رہتا ہے۔ ایسا کماؤ دنیا میں اور کون ہوگا؟"
اتنے میں بھولا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ اسے بھی یہ ڈھیر دیکھ کر تعجب ہوا۔ ماں سے بولا: "کیا شنکر آج بڑی رات گئے اٹھا تھا اماں؟"
"وہ تو پڑا سو رہا ہے۔ میں نے سمجھا تم نے کاٹا ہے۔"
"میں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکتا۔ دن بھر چاہے جتنا کام کرلوں لیکن رات کو مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔"
"تو کیا تمہارے دادا نے کاٹی ہے؟"
"ہاں! یہی معلوم ہوتا ہے۔ رات بھر سوتے نہیں۔ مجھ سے کل رات بڑی بھول ہوئی۔ ارے وہ تو ہل لے کر جا رہے ہیں۔ جان دینے پر تل گئے ہیں کیا؟"
"غصیلے تو کبھی کے ہیں۔ اب کسی کی سنیں گے تھوڑا ہی۔"
"شنکر کو جگا دو۔ میں بھی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہل لے کر جاؤں۔"
جب اور کسانوں کے ساتھ ہل لے کر بھولا کھیت میں پہنچا تو سوجان آدھا کھیت جوت چکے تھے۔ بھولا نے چپکے سے کام کرنا شروع کیا۔ سوجان سے کچھ بولنے کی کسی کو بھی ہمت نہ پڑی۔
دوپہر ہوئی۔ سب کسانوں نے بیل چھوڑ دیئے۔ لیکن سوجان اپنے کام میں مگن رہے۔ بھولا تھک گیا۔ اس کی بار بار یہی خواہش ہوتی کہ بیلوں کو کھول دے مگر مارے خوف کے کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کو حیرت ہوتی تھی کہ دادا کیسے اتنا کام کرتے ہیں۔ آخر

ڈرتے ڈرتے بولا۔

"دادا! اب تو دوپہر ہوگئی۔ ہل کھول دیں ذرا؟"

"ہاں کھول دو۔ تم بیلوں کو لے کر چلو۔ میں ڈانڈ پھینک کر ابھی آیا۔"

"میں شام کو پھینک دوں گا۔"

"تم کیا پھینک دوگے۔ دیکھتے نہیں کہ کھیت کٹورے کی مانند گہرا ہوگیا ہے۔ تبھی تو بیچ میں پانی جم جاتا ہے۔ اس طرح کے کھیت میں بیس من کا بیگھہ ہوتا تھا۔ تم لوگوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔"

بیل کھول دیے گئے۔ بیلوں کو لے کر بھولا گھر چلا۔ لیکن سوجان ڈانڈ پھینکتے رہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ ڈانڈ پھینک کر گھر آئے لیکن تھکن کا نام بھی نہ تھا۔ نہا، کھا کر آرام کرنے کی بجائے انھوں نے بیلوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، پاؤں ملے اور دم سہلائی۔ بیلوں کی دم کھڑی تھی۔ سوجان کی گود میں سر رکھے انھیں ناقابل بیان مسرت مل رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج انھیں یہ راحت میسر آئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے جذبے ابل رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے تھے کہ تمھارے ساتھ رات دن ایک کرنے کو تیار ہیں۔

دوسرے کسانوں کی طرح بھولا ابھی کمر ہی سیدھی کر رہا تھا کہ سوجان ہل اٹھا کر کھیت کی طرف چل دیا۔ دونوں بیل امنگ سے بھرے بھاگے چلے جا رہے تھے جیسے انھیں خود کھیت میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

بھولا نے غنودگی میں ہی باپ کو ہل لے جاتے دیکھا لیکن اٹھ نہ سکا۔ اس کی ہمت چھوٹ گئی۔ اس نے کبھی اتنی محنت نہ کی تھی۔ اسے بنی بنائی گرہستی مل گئی تھی۔ اس کو ہی کسی نہ کسی طرح چلا رہا تھا۔ اس قیمت پر وہ گھر کا مالک بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جوان آدمی کو دھندے ہوتے ہیں۔ ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کے لیے اسے وقت چاہیے۔ پڑوس کے گاؤں میں دنگل ہو رہا ہے۔ جوان آدمی خود کو کیسے وہاں جانے سے روک سکے گا؟ کسی گ

میں برات آئی ہے محفل رقص و سرود گرم ہے۔ گبرو کیسے اس لطف سے محروم ہو سکتا ہے؟ بوڑھوں کے لیے یہ رکاوٹیں نہیں۔ انھیں نہ ناچ گانے سے مطلب نہ کھیل تماشے سے غرض۔ محض اپنے کام سے سروکار ہے۔

بلاقی نے کہا "بھولا تمھارے دادا ہل لے کر گئے"

"جانے دو اماں۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا"

(۵)

سوجان کے اس نئے حوصلے پر گاؤں بھر میں تبصرے ہوئے۔ نکل گئی ساری بھگتی۔ بنا ہوا تھا۔ ایا میں پھنسا ہوا ہے۔ آدمی کا ہے کو ہے بھوت ہے۔ مگر بھگت جی کے دروازے پر اب پھر سادھو سنت آسن جمائے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اب کے اس کی دھرتی نے سونا اگل دیا۔ کوٹھار میں اناج رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جس کھیت میں مشکل سے پانچ من ہوتا تھا اب اس میں دس من اناج پیدا ہوا۔

چیت کا مہینہ تھا۔ کھلیانوں میں ست یگ کی حکومت تھی۔ جگہ جگہ اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہی وقت ہے جب کسانوں کو ایک لمحے کے لیے اپنی زندگی کامیاب معلوم دیتی ہے۔ جب فخر سے ان کا دل اچھلنے لگتا ہے۔ سوجان بھگت ٹوکرے میں اناج بھر بھر کر دیتے اور لڑکے انھیں تھام کر گھر پہنچانے جاتے۔ کتنے ہی بھاٹ اور فقیر بھگت جی کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں وہ سادھو تھا جو آج سے آٹھ مہینے قبل ان کے در سے مایوس لوٹا تھا۔

اچانک بھگت نے اس فقیر سے پوچھا "کیوں بابا! آج کہاں کہاں چکر لگا آئے؟"

"ابھی تو کہیں نہیں گیا بھگت! پہلے تمھارے ہی پاس آیا ہوں"

"اچھا تمھارے سامنے یہ انبار ہے۔ جتنا اناج اٹھا سکتے ہو اٹھا لو"

فقیر نے حریص نگاہوں سے ڈھیر کو دیکھ کر کہا "جتنا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دے دو تے اتنا ہی لے لوں گا"

"نہیں تم سے جتنا اٹھایا جا سکے اٹھالو۔"

فقیر کے پاس ایک چادر تھی۔ اس نے کوئی دس سیر اناج اس میں بھرا اور اٹھا
سکا۔ جھجک کے مارے اور زیادہ بھرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔

بھگت اس کے دل کا مطلب بھانپ کر حوصلہ دلاتے ہوئے بولا۔

"بس! اتنا تو ایک بچہ بھی اٹھالے جا سکتا ہے۔"

فقیر نے بھولا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میرے لیے اتنا ہی بہت
"نہیں، تم جھجکتے ہو۔ اتنا اور بھرو۔"

فقیر نے پانچ سیر اناج اور بھرا اور بھولا کی طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اس کی طرف کیا دیکھتے ہو بابا جی! میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔ تم سے جتنا اٹھا
جا سکے اٹھاؤ۔"

فقیر ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے اناج بھر لیا اور بھولا نے گٹھری نہ اٹھائی تو کتنی
خفت ہوگی۔ دوسرے فقیروں کو ہنسنے کا موقعہ مل جائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ فقیر کتنا لالچی
ہے۔ اسے اور اناج بھرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تب سورجن بھگت نے چادر میں اور اناج بھرا۔ اس کی گٹھری باندھ کر بولا۔ "اب
اٹھالے جاؤ۔"

"بابا! اتنا تو مجھ سے اٹھ نہ سکے گا۔"

"ارے اتنا بھی نہ اٹھ سکے گا؟ بہت ہوگا تو من بھر۔ پہلا زور تو لگاؤ۔ دیکھوں
سکتے ہو یا نہیں۔"

فقیر نے گٹھری کو پہلے آزمایا۔ بھاری تھی۔ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ بولا۔ "بھگت
یہ مجھ سے نہ اٹھے گی۔"

"اچھا بتاؤ۔ کس گاؤں میں رہتے ہو؟"

"بڑی دور ہے بھگت جی۔ امولا کا نام تو سنا ہوگا۔"

"اچھا آگے آگے چلو۔ میں پہنچا دوں گا۔"

یہ کہہ کر بھگت جی نے زور لگا کر گٹھری اٹھائی اور فقیر کے پیچھے ہو لیے۔ دیکھنے والے بھگت کا یہ جذبہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ بھگت جی پر اس وقت دن سانشہ سوار ہے۔ آٹھ مہینوں کی مسلسل اور انتھک محنت کا انھیں آج پھل ملا ہے۔ آج انھوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا تھا۔ وہی تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی دھار چڑھ کر لوہے کو بھی کاٹ دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز ہے۔ جس ں لاگ ہے وہ بوڑھا بھی جوان ہے۔ جس میں لاگ نہیں، عزت نہیں، وہ جوان بھی ہو تو رہ ہے۔ سو جان میں حمیت تھی۔ اس نے اسے غیر معمولی قوت دی۔ چلتے وقت انھوں نے بھولا کو پُرغرور نظروں سے دیکھا اور کہا "یہ بھاٹ اور فقیر کھڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی لی ہاتھ نہ جانے پائے۔"

بھولا سر جھکائے کھڑا رہا۔ اسے کچھ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بوڑھے باپ نے اسے ادیا۔

پوس کی رات

ہلکو نے اپنی بیوی سے آکر کہا: "شہنا آیا ہے۔ لاؤ جو روپے رکھے ہیں اسے دے دوں۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے۔"

منی جھاڑو لگا رہی تھی، پیچھے پھر کر بولی: "تین ہی تو روپے ہیں۔ دے دو تو کمبل کہاں سے آئے گا؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اس سے کہہ دو کہ فصل پر روپے دے دیں گے۔ ابھی نہیں ہیں۔"

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا۔ پوس سر پر آگیا ہے بغیر کمبل کے رات کو وہ کسی طرح کھیت پر نہیں سو سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں۔ وہ گھڑکیاں دے گا، گالیاں سنائے گا، بلا سے جاڑے میں مریں گے، یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا، اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا: "لا دے دے۔ گردن تو کسی طرح سے بچے، کمبل کے لیے کوئی تدبیر سوچوں گا۔"

منی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کر کے بولی: "کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سنوں کون سی تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا۔ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں۔ تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام

پیداوار ہو تو اس سے باقی ادا کرو۔ چلو چھٹی ہوئی۔ باقی چکانے کے لیے ہی تو ہمارا جنم ہوا ہے۔ ایسی کھیتی سے تو باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی۔ نہ دوں گی۔"

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا "تو کیا گالیاں کھاؤں؟"

منی نے کہا "گالیاں کیوں دے گا۔ کیا اس کا راج ہے؟" مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھنویں ڈھیلی پڑ گئیں ـــــ ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی سچائی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی ـــــ اس نے طاق پر سے پیسے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیئے پھر بولی "تم اب کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو چین سے کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی ـــــ اچھی کھیتی ہے، مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس الگ۔"

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے وجھ سے دبا جا رہا تھا۔

(۲)

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے ادکھ کی پتیوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر پنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی "جبرا" پیٹ میں منھ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا "کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے۔ کہا تو تھا

کہ گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں۔ جانتے تھے کہ میں حلوہ پوری کھانے جا رہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔

جبرا نے پڑے پڑے دم ہلائی اور ایک جمائی لے کر چپ ہو گیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا "کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ رانڈ کچھ اہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔ اٹھو پھر ایک چلم بھرو۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ اٹھ جل تو پی چکا — یہ کھیتی کا مزہ ہے اور بھگوان کچھ ایسے ہیں — جن کے پاس جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے موٹے گدے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے مزدوری ہم کریں، مزہ دوسرے لوٹیں"۔

ہلکو اٹھا اور گڑھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری۔ جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔

ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا "پیے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے، ہاں ذرا من بہل جاتا ہے"۔

جبرا نے اگلے پنجے اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو، اب کی سو جاؤں گا۔ لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا کبھی اس کروٹ لیٹا، کبھی اس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپتھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اسے اپنی گود سے چمٹائے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ جنت یہیں ہے اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اس کو کتے سے بالکل نفرت

نہ تھی۔

وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیے تھے اور اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ سنی۔ اس کے مالک کی اس خالص روحانیت نے اس کے دل میں ایک نئی طاقت پیدا کر دی تھی جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپر سے باہر آ کر بھونکنے لگا۔

ہلکو نے اسے کئی بار پچکار کر بلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(۳)

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ابھی کتنی رات باقی ہے؛ وہ سات ستارے جو قطب کی گرد گھومتے ہیں، ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر پائے تھے۔ جب وہ اوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک پہر سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گیا تھا ـــــ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے گا کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو

بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اوپلہ لے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا "اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں۔ ٹانٹے ہو جائیں گے تو پھر آکر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔"

جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے اتفاق کیا اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں ـــ یکایک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا "کیسی اچھی مہک آئی جبرا ـــ! تمہاری ناک میں بھی کچھ خوشبو گئی۔ جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اسے چبوڑ رہا تھا۔ ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے، ننگے پاؤں گلے جاتے تھے اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس ہلتی ہوئی روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ اس اتھاہ اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں روشنی ایک ناؤ کی مانند ہوتی ہے۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبائی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے، گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا "تیرے جی میں جو آئے کر ـــ" سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا "کیوں جبرے! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی؟"

جبرا نے کون کون کر کے گویا کہا "اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی؟"
"پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی نہیں تو اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟"
جبرا نے دم ہلائی۔
"اچھا آؤ۔ اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔"
"اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔"
جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی طرف دیکھا۔
"منی سے کل نہ کہہ دینا ورنہ لڑائی کرے گی۔"
یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔
ہلکو نے کہا "چلو چلو اس کی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔"
وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

(۴)

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے ابھی کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی۔ ہر ایک لمحے میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔
ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی ـــــ پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اسے سستی دبائے لیتی تھی۔
دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آ گیا ہے ـــــ شاید نیل گایوں کا تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔

اس نے دل میں کہا "نہیں جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت میں نہیں آسکتا نوچ ہی ڈالے گا ــــ مجھے وہم ہوا ہے ! اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا ــــ !"

اس نے زور سے آواز لگائی "جبرا ــــ جبرا ــــ"

جبرا بھونکتا رہا۔ اس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر سنائی دینے لگی۔ ہلکو اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا، جانوروں کو بھگانا ــــ ان کا پیچھا کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلّانے لگا۔

" ہو، ہو، ہو، ہو، ہا ہا ــــ"

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا۔ جانور کھیت چر رہے تھے۔ فصل تیار ہے مگر یہ ظالم جانور اس کا ستیاناس کیے ڈالتے ہیں۔

ہلکو پکا ارادہ کر کے اٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایک ایسا ٹھنڈا چبھنے والا بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آبیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا، نیل گائیں صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔ افسردگی نے اسے چاروں طرف سے رسّی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

اسی راکھ کے پاس زمین پر وہ چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ اور منی کھڑی کہہ رہی تھی ــــ "تم کہاں آکر مر گئے۔ ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔"

ہلکو نے اٹھ کر کہا "کیا تو کھیت سے ہو کر آرہی ہے ؟"

منی بولی "ہاں سارے کھیت کا ستیاناس ہوگیا۔ بھلا ایسا بھی کوئی سوتا ہے؟ تمھارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا فائدہ ہوا؟"

ہلکو نے بہانہ کیا "میں مرتے مرتے بچا۔ تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اٹھا تھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔"

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈے پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں۔ اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے ـــــ گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی مگر ہلکو خوش تھا۔

منی نے فکرمند ہوکر کہا "اب مجوری کرکے مال گجاری دینی پڑے گی۔"

ہلکو نے خوشی کے لہجے میں کہا "رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔"

"میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی کہے دیتی ہوں کہ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں، مرنے کے لیے نہیں کرتے ـــــ"

"جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔"

"آج جاکر شہنا سے کہہ دو۔ کھیت جانور چر گئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔"

"رات بڑے گجب کی سردی تھی۔"

"میں کیا کہتی ہوں، تم کیا سنتے ہو ـــــ"

"تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ شہنا کو ان باتوں سے کیا مطلب؟ تمھارا کھیت چاہے جانوروں نے کھایا چاہے آگ لگ جائے، اولے پڑ جائیں۔ اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔"

"تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔"

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا ـــــ "جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی

چھوڑ دوں ۔ منی تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجبوری کا خیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے، کھیتی کا کام نہ بگاڑوں گا۔

جبرا! جبرا! کیا سوتا ہی رہے گا؟ چل گھر چلیں۔

طلوعِ محبّت

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑیوں کا ایک گٹھا سر پر لیے آیا اور اسے پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا تھا "کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا؟"

شام ہو گئی تھی پھر بھی لو چلتی تھی اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا ـــــ دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی اور سمجھا تھا اس تپسیا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔ لیکن آ کر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا "لا ایک پانی کا لوٹا دے دے، بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن میں۔ بخار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے۔"

بنٹی نے سر کی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا "دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی۔ منہ دھو رکھو۔"

بھوندو نے آنکھیں سکوڑ کر جواب دیا "کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ دھرم وہ کرتا ہے جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کماک کریں گے پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں دھرم کیا کریں گے؟"

بنٹی نے اپنا وار ادھیا پڑتے دیکھ کر چوٹ کی "دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھرسکیں مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے؟ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا — دھرم جھکرلا کیا اکیلے نہیں چلتا؟"

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑگئے۔ بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کرسکتا تھا مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، جو تن تنہا سو پچاس نوجوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا "جورو دھرم گنوانے کے لیے نہیں لائی جاتی، دھرم کمانے کے لیے لائی جاتی ہے۔"

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے ساتھ گزر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی، ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء، ایک طرف اناج کے مٹکے، دروازہ پر ایک کھوٹی پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا تو سارا ساز و سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی، ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اس بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی بیاہ، لین دین، جھگڑے قضیے ہوتے رہتے تھے۔ اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لیے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آکر انھیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرا لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے کیوں کہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے اور ان کے ہاتھ میں

جاکر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار ان سے ڈرتے تھے۔ کیوں کہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو شوہر کی یہ پاک دامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا جاتا تھا۔ کچھ مل جاتا تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شے نہ ملی نہ کوئی جانور، نہ خس، نہ جڑی نہ بوٹی۔

بنٹی نے کہا "جن سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے۔"

بھوندو نے کہا "تو میں نکھٹو ہوں۔"

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا "میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں سب کھاتی ہیں، پہنتی اوڑھتی ہیں کیا میرے ہی دل نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بیاہ کر کے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا "جانتی ہے پکڑا گیا تو تین سال سے کم سجا نہ ہو گی۔"

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی "جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے تو تم ہی کیوں پکڑے

جاؤ گے ؟"

بھوندو: "اور لوگ پولیس کی کھسامد میں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے میں بھی یہ کام کروں ؟"

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی "میں تمھارے ساتھ سستی ہونے نہیں آئی۔ پھر تمھارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں جا گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔"

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کرے گی۔ یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اس طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی ساری زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہ میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی، وہ اعتماد نہیں رہا مضبوط دیوار کو ٹھکاؤنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب دیوار ہلنے لگتی ہے تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا اس کی طرف سے بھی بے فکر تھا۔ وہ جس طرح خود رہتا تھا اسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا وہی اسے کھلاتا تھا۔ اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ یہ آج اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی اپنی نہیں ہے۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہوگی

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آرہا ہے۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ آج بھوندو نے باہر آکر اسے پچکارا، اس کی پیٹھ سہلائی اور اسے پانی پلانے کے لیے ڈول اور رسی لے کر کنویں پر چلا گیا۔

(۲)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہوگئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا "کل جنگل سے نہیں لوٹا صبح کے وقت بھوندو آپہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیے۔ روپوں کی کیا پہچان ہوسکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا "اگر کوئی پوچھے، اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟"

بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا "کہہ دوں گی کیوں بتاؤں۔ دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں؟"

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا "یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی۔ تو کہہ دنیا میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی آرہی ہوں۔ ہمارا خرچ ہی کون سا لمبا ہے۔"

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لیے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں، ایک ایک جڑی کے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ گھس، گھاس جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہوکر دونوں بازار چلے۔ بنٹی نے اپنے لیے کئی قسم کے کپڑے چوڑیاں، بندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے۔ خوب شراب پی اور دو بوتلیں رات کے لیے لے کر گھومتے پھرتے، گاتے بجاتے، گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانے پکانے لگی تو پڑوسنوں نے تنقید شروع کردی۔

"کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔"

"بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے۔"

"بگلا بھگت ہے۔"

"بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑ رہی ہے۔"

"آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی بھی دینے نہ اٹھتی تھی۔"

اس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خود داری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی۔ ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے اس میں سے دیوتاؤں کو گھلا دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لوگوں سے اپنی چوری کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کسی کو خبر نہ دی، یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا "اب کھانے کے وقت کہاں چلے؟"

"ابھی آتا ہوں۔"

"مت جاؤ، مجھے ڈر لگتا ہے۔"

بھوندو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا "مجھے دیر نہ لگے گی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے۔"

اس نے گنڈاسا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ہے۔ اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقے سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہاں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(۳)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے، منہ پر ابٹن ملا، صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا تو اس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیا ضرور خرید لائے گی اور روز اس سے منہ دھوئے گی۔ بال سنوار کر اس نے ماتھے پر اسی کا لعاب لگایا کہ بال ادھر ادھر منتشر نہ ہو جائیں۔

پھر پان لگائے۔ چونا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اس نے سمجھا، شاید پان کھانے کا مزہ ہو۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے مزے سے کھاتے ہیں۔ لال رنگ کی ساڑی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے، میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ روز تو سانجھ سے دروازے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے۔ بنٹی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑتے ہی اس کی نسائیت اگ آئی تھی۔ خفگی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ بھوندو آ رہا ہے۔ وہ دوسری مرتبہ سرکی کے اندر دوڑ آئی اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن، ایسی الجھن اسے آج تک

کبھی نہ ہوتی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی۔ اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پرلطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال!

صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ معاً کسی نے آکر اطلاع دی۔ بنٹی رات بھوندو پکڑ گیا۔

(۴)

بنٹی تھانے پہنچی تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انھوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا تو چوک گئے۔ شعور نہ تھا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی "یہی تو ہے بھوندو کی عورت، اسے بھی پکڑ لو"۔

بنٹی نے اکڑ کر کہا "ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟"

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا "دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔"

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا "ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لیے

بھجوادوں گا۔ تین سال کے لیے۔ صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو، اسی میں خیریت ہے۔"

بھوندو نے بیٹھے بیٹھے کہا: "کیا کہہ دوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں ان کا گلا کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی دینے دلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا: "ہاں ہاں سکھا پڑھا دے بیوی کو کہ کہیں بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبھکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لیے جائے گا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دے۔"

بھوندو نے بے پروائی سے کہا: "داروغا ساب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں کے آگے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس فولاد کا جھکنا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شیروں کا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانے دار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر منٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لیے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔

"داروغا جی! تم سمجھتے ہو گے۔ ان گریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

تھانیدار نے مسکرا کر کہا: "تجھے کیا۔ یہ مر جائے گا کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا وہ تو تیرے ہی پاس ہو گا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لوٹا دے، تو نے ہی منتر دیا ہو گا۔ گلابی ساڑھی اور

پان اور خوشبودار تیل کے لیے تو ہی بے قرار ہو رہی ہوگی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عجیب عورت ہے۔"

بنٹی نے چند لمحے غور کیا اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی "اچھا دارو گا ساب! میں سب کچھ دے دوں گی ان پر حرف نہ آنے پائے۔"

(۵)

بھوندو کو باہر نکالا گیا تو اس نے خائف ہو کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

ایک چوکیدار نے کہا "تیری عورت نے اقبال کر لیا ہے۔"

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا اور آواز بند سی ہو گئی تھی لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے بیدار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں اور بولا "کیا کہا؟"

"کیا کہا۔ چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات ہی اقبال کر لیتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی۔"

بھوندو نے گرج کر کہا "وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"وہاں مال بھی برآمد ہو گیا تم ابھی تک اپنی گا رہے ہو۔"

اپنے آباؤ اجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکایک بنٹی آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کے مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا اب کہاں جاؤں؟ بھوندو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پڑوسنوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں، اسے کھینچ کر ڈیرے کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینی حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں۔ صرف اس کی سرکی ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا تو اس کی وہی حالت ہوئی جو خالی گھر کو دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اٹھائے۔ اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے۔ لیکن آج اسے اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیاء ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ بنٹی کو شبہ ہوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں شاید کسی نے چھیڑی تھیں۔ پاؤں پر جو گیلا کپڑا لپٹا تھا وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھوندو آ رہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں۔ بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھوندو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا؟ کچھ سنے گا۔ سوال

جواب کرے گا۔ یونہی گنڈاسا چلا دے گا۔ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایا۔ مرجادا جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندو کو ہو گی۔ اسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے گا۔

اس نے سر کی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بھوندو نہ تھا، اس کا گدھا آرہا تھا۔ بنٹی آج اس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لیے تھکا ماندہ چلا آرہا ہو۔ اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی، اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اسے چھوٹی آنکھوں نہ بھاتا تھا پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے سوچا کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا۔ ان آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا۔ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی اور پھلوڑیاں کھائیں۔ جب اسے مرنا ہی ہے تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے دوسرا پیالہ بھرا اور وہ بھی پی گئی۔ زیادہ ٹھرا جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولانے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی۔

اس نے سوچا۔ بھوندو پوچھے گا۔ تو نے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی؟ کہہ دے گی۔ ہاں پی۔ کیوں نہ پیتے۔ اسی کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا۔ وہ ایک بوند نہ چھوڑے گی جو ہونا ہے ہو جائے۔ بھوندو اسے مار نہ سکے گا۔ وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ سیکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں ـــــ آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی۔ بیچارہ جو کچھ کماتا ہے اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ اپنے لیے ایک پیسہ کا تمباکو

بھی لیتا ہے تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے۔ جو کام اس سے نہیں ہوتا اسے کیوں ....

معاً ایک کانسٹبل نے آکر کہا: "ارے بنٹی! کہاں ہے؟ چل کر دیکھ بھوندو کا کیا حال ہے۔ بے حال ہو رہا ہے۔ ابھی تک چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر سر پر پٹک دیا۔ سر سے لہو بہہ رہا ہے۔ ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے دی تھی۔

(۶)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سرکی اب بھی اس ویرانی میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکرمندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے اٹھ کر باہر دیکھوں مگر اٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی گٹھری لیے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی مگر تار تار۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا: "تو اتنی بھیگ رہی ہے، کہیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں تو اتنا کیوں مرتی ہے۔ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے؟"

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا: "کچھ بھی تو نہیں ہے، کیسی ہانڈی؟"

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھولی اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا: "ابھی لوٹا نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا۔"

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا: "ذرا آئینہ میں صورت دیکھو۔ گھی، دودھ کچھ نہ

ملے گا تو کیسے اٹھو گے یا ہمیشہ چارپائی پر پڑے رہنے کا ارادہ ہے؟"

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا: "اپنے لیے ایک ساڑھی بھی نہیں لائی میرے لیے گھی اور دودھ سب چاہیے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔"

بنٹی نے مسکرا کر کہا: "اسی لیے تو گھی کھلاتی ہوں کہ تم جلدی سے۔ کام دھندا کرنے لگو اور میرے لیے ساڑھی لاؤ۔"

بھوندو بولا: "تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں۔ کیوں؟"

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا: "پہلے میرا گلا کاٹ دینا پیچھے۔"

نجات

دکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا اور اس کی بیوی جھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا۔

"تو جاکر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔"

دکھی: ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟"

جھریا: کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا۔"

دکھی: تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جاکر ایک لوٹا پانی مانگو تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھالے جائے اپنی کھٹولی دھوکر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔

جھریا: ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے دھرم سے رہتے ہیں۔

دکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔" ہاں یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنالوں، تو ٹھیک ہو جائے۔ پتل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لاتو لاٹھی، پتے توڑ لوں۔"

جھریا : پتل میں بنالوں گی۔ تم جاؤ۔ لیکن ہاں انھیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے۔ پتل میں سیدھا بھی دے دینا مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھر پور، سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، نمک، ہلدی اور تیل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے تو پھر جن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا ورنہ گجب ہو جائے گا۔

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اٹھائی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر تو باباجی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

(۲)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اپاسنا میں لگ جاتے، منھ ہاتھ دھوتے آٹھ بجتے، تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متواری خطوط کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا۔ پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار دروازے پر آجاتے۔ ایشور اپاسنا کا فی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے۔

انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی چھوٹا سا گول مول آدمی۔ چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں۔ اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدس عطا کر دی تھی۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے۔

"آج کیسے چلا آیا رے دکھیا؟"

دکھی نے سر جھکا کر کہا۔ "بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہو گی؟"

گھاسی۔ "آج تو مجھے چھٹی نہیں۔ شام تک آجاؤں گا۔"

دکھی: نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟"

گھاسی: اس گائے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑو دے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے اسے بھی اٹھا لانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک گوبر سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا۔ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بے چارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزما لیا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار تھی۔ دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا

دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک پڑتا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آجاتی۔ اس نے سوچا۔ یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر، محنت سپھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی۔

دکھی نے کہا: "آگ کی فکر نہ کرو بھائی، پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔"

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا: "مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔"

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا: "یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟"

"تو دے دو۔"

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا: "تمھیں تو جیسے پوڑی پیڑے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ کبھی نہ رہی۔ چمار ہوا، دھوبی ہوا، پاسی ہو۔ منھ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا، کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے ورنہ اسی آگ سے منھ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔"

پنڈت جی نے انھیں سمجھا کر کہا: "اندر آگیا تو کیا ہوا۔ تمھاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی، زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں۔ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔

کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑتا تو کم از کم چار آنے لیتا۔

پنڈتانی نے گرج کر کہا: "وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟"

پنڈت نے ہار کر کہا: "سسرے کی بدقسمتی تھی۔"

پنڈتانی: اچھا اس وقت تو آگ دے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی۔

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بے چارا پچھتا رہا تھا۔ ناحق چلا آیا۔ سچ کو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چہ چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا۔ مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لیے جب پنڈتانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ پنڈتانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر میں چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟"

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انھوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر نے لگیں۔

باہر آکر اس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈتانی کو کچھ رحم آگیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں: "اس چمار کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہو گا۔"

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔

"روٹیاں ہیں؟"

پنڈتانی: دو چار بچ جائیں گی۔

پنڈت: دو چار روٹیوں سے کیا ہوگا؟ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا۔

پنڈتانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں: "ارے باپ رے۔ سیر بھر، تو پھر رہنے دو۔"

پنڈت جی نے اب تیر بن کر کہا: "کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انھیں تو جوار کا ٹکڑ چاہیے۔"

پنڈتانی نے کہا: "اب جانے بھی دو، دھوپ میں مرے۔"

(۳)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آگئی تھی تقریباً آدھ گھنٹہ تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آگیا۔ بولا "بوڑھے دادا جان کیوں دم دیتے ہو۔ تمہارے پچاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہوتے ہو۔"

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا: "بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے۔"

گونڈ: کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کروانا جانتے ہیں۔ جا کے مانگتے کیوں نہیں؟"

دکھی: تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟

گونڈ: پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پر تاؤ دے کر کھانا کھایا اور آرام سے پڑ رہے ہیں۔ تمہارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔

دکھی نے کہا: "بھائی آہستہ بولو۔ کہیں سن لیں گے تو بس!"

یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا۔ گونڈ کو اس پر رحم آگیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہوا۔ بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا: "یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔"

دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انھوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھر ہے۔ ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے۔ مگر انھیں اس کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اٹھا لاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹی۔ کل آکر پھاڑ دوں گا۔

اس نے ٹوکرا اٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا۔ مگر سر پر اٹھاتا کون؟ خود اس سے نہ اٹھ سکتا۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے بھوسہ ختم ہوا۔ پنڈت کی نیند بھی کھلی، منہ ہاتھ دھو کے پان کھایا اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ دور سے بولے: "ارے دکھیا! تو سو رہا ہے۔ لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے۔ اتنی دیر کیا کرتا رہا؟ مٹھی بھر بھوسہ اٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اٹھا لے اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے ذرہ بھر لکڑی بھی نہیں پھٹتی۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جہاں نیچ کے گھر کھانے کو ہوا اس کی لکھ بدل جاتی ہے۔"

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں، وہ سب بھول گئیں۔ پیٹ بیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اٹھا۔ پنڈت ہیں۔ ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر سفینہ ناس ہو جائے۔ تب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا

مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے۔ جسے چاہیں بنادیں، جسے چاہیں بگاڑ دیں گے۔
پنڈت جی گانٹھ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ہاں مارکس کے۔
اور کس کے مار۔ ایسے زور سے مار، تیرے ہاتھوں میں جیسے دم ہی نہیں۔ لگا کس کے۔
کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے۔ ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے، اس سوراخ میں۔"
دکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی
تھی۔ تکان، بھوک، پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوت
بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی
طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی کے
ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا پیاسا
تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی نے پکارا۔ اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔
پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔"
پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر جا کر بوٹی چھانی۔ حاجات
ضروری سے فارغ ہوئے، نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔ دکھی ابھی تک
وہیں پڑا ہوا تھا۔ زور سے پکارا "ارے دکھی! کیا پڑے ہی رہو گے۔ چلو تمہارے ہی
گھر چل رہا ہوں۔ سب سامان ٹھیک ہے نا؟"
دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔
اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بدحواس
ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے "دیکھا تو جیسے مر گیا۔"
پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں "ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا!؟"
"ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہو گا؟"
پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا "ہو گا کیا، چمروٹے میں کہلا بھیجو مردہ اٹھا لے جائیں۔"

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنویں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیوں کر بھرا جائے؟ چمار کی لاش کے پاس ہو کر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا "مردہ کیوں نہیں اٹھواتے، کوئی گاؤں میں پانی پیے گا یا نہیں؟"

ادھر گونڈ نے چمروٹے میں جا کر سب سے کہہ دیا "خبردار مردہ اٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی۔ دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ لاش اٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمروٹے میں کوئی آدمی لاش اٹھالانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آکر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی۔ پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا کہ ایک بھی من نہ سکا۔ آخر نا امید ہو کر لوٹ آئے۔

(۴)

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہ آیا۔ اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھاتے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہو، کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا "ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی۔ ان سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔"

پنڈت نے کہا "چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مر گیا تو شور و غل مچانے کے لیے سب کی سب آپہنچیں۔"

پنڈتانی : چماروں کا رونا منحوس ہوتا ہے ؟

پنڈت : ہاں بہت منحوس ۔

پنڈتانی : ابھی سے بو آنے لگی ۔

پنڈت : چمار تھا سبرا کہیں کا ۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا ۔

پنڈتانی : ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی ۔

پنڈت : سب کے سب بھرشٹ ہیں ۔

رات تو کسی طرح کٹی مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا ۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی ۔ بدبو پھیلنے لگی ۔

پنڈت جی نے ایک رسّی نکالی ۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندا کو کھینچ کر کس دیا ۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا ۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے ۔

وہاں سے آکر فوراً نہائے ، درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا ۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ ، گدھ اور کوّے نوچ رہے تھے ۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی ، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا ۔

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ ہم جب کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بے وقوف ہے، یا اس کی سادہ لوحی اور انتہا درجہ کی قوت برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے، مگر سینگ مارتی ہے۔ کتا بھی غریب جانور ہے لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی آجاتا ہے مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ جتنا جی چاہے مار لو، چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو، اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو، پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ دکھ، نفع نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی منیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں سب اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن آدمی اسے بیوقوف کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دنیا میں سیدھے پن کے لیے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے جو اس سے کچھ ہی کم گدھا ہے اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے۔ بیل کبھی کبھی مارتا ہے،

کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ کبھی کئی طریقوں سے یہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا اور دوسرے کا موتی۔ دونوں بچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت، کام میں چوکس، ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت ہوگئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں کر سمجھ جاتے یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابل فہم قوت تھی جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی کبھی دونوں سینگیں ملا لیا کرتے تھے، عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے، محض ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسہ پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے اور ایک ساتھ ہی بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹا لیتا تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

(۲)

ایک دفعہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لیے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے، مالک نے ہمیں بیچ دیا۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انھیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں

پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمھاری خدمت کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تو اور کام لے لیتے ہم کو انکار نہ تھا۔ ہیا تمھاری خدمت میں مرجانا قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھا لیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منھ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انھوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گاؤں، نئے آدمی سب انھیں بیگانے سے لگتے تھے۔ دونوں نے جیپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔ جب گاؤں میں سناٹا پڑ گیا تو دونوں نے زور مار کر پگہے تڑا لیے اور گھر کی طرف چلے۔ پگہے بہت مضبوط تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ بیل انھیں توڑ سکیں گے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دوگنی طاقت آگئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔ جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنے پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردن میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے بادلا ہو گیا اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا، کوئی گڑ، کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔ ایک لڑکے نے کہا "ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے۔" دوسرے نے

تائید کی۔ "اتنی دور سے اکیلے چلے آئے۔" تیسرا بولا "پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے۔"
اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا "ہاں بھئی ضرور ہوں گے۔"
جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی۔ بولی "کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا، بھاگ کھڑے ہوئے۔"
جھوری اپنے بیل پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا "نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا تو کیا کرتے۔"
عورت نے تنگ آکر کہا "بس تمھیں بیلوں کو کھلانا جانتے ہو اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔"
جھوری نے چڑایا "چارہ ملتا تو کیوں بھاگتے؟"
عورت چڑی "بھاگے اس لیے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور، بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہیں مریں۔"
وہی ہوا۔ مزدور کو کڑی تاکید کر دی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسہ دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکنا ہٹ نہ رس۔ کیا کھائیں۔ پر امید نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگے۔
جھوری نے مزدور سے کہا "تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے؟"
مزدور: مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی۔
جھوری: ڈال دے تھوڑی سی۔
مزدور: نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انھیں کی سی کہو گے۔

(۳)

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوتِ برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھ دیا اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی، چوناسب کچھ دیا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انھیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی۔ اس پر خشک بھوسہ۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا مگر انھوں نے پاؤں نہ اٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باہر ہوگیا۔ ہل لے بھاگا۔ ہل، رسی، جوا، جوت، سب ٹوٹ کر برابر ہوگئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں تو وہ دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا "بھاگنا مشکل ہے"۔

موتی نے کنکھیوں سے جواب دیا "تمھاری تو اس نے جان لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑے گی"۔

ہیرا: پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے تو مار سے کہاں بچیں گے۔ گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی: کہو تو میں بھی دکھادوں کچھ مزہ؟

ہیرا: نہیں بھائی کھڑے ہوجاؤ۔

موتی : مجھے مارے گا تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا۔

ہیرا : یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔

موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ گیا آپہنچا اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی نہیں تو موتی بھی تیار تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسہ لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لے کر نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحب دل ہے۔ لڑکی گیا کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اسے مارتی تھی اس لیے ان بیلوں سے اسے ہمدردی ہو گئی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے، اڑتے، ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیے جاتے اور رات کو وہی لڑکی انھیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا "اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا"

ہیرا : کیا کرنا چاہتے ہو؟

موتی : گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں؟

ہیرا : مگر وہ لڑکی اس کی بیٹی ہے۔ اسے مار گراؤ گے تو وہ یتیم ہو جائے گی۔

موتی : تو مالکن کو پھینک دوں؟ وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔

ہیرا : عورت کو مارو گے بڑے بہادر ہو۔

موتی : تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔

ہیرا: ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ایسی موٹی رسی ٹوٹے گی کیوں کر؟

موتی: پہلے رسی کو چبالو۔ پھر جھٹکا دے کر توڑالو۔

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی تو دونوں رسیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی۔ بچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دمیں کھڑی ہوگئیں۔ اس نے ان کی پیشانی سہلائی۔ بولی "کھول دیتی ہوں۔ بھاگ جاؤ، نہیں تو یہ لوگ تمھیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشورہ ہو رہا ہے کہ تمھاری ناک ناتھ ڈال دی جائیں"۔ اس نے دونوں کے رسّے کھول دیے۔ پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ موتی نے اپنی زبان میں پوچھا "اب چلتے کیوں نہیں؟"

ہیرا نے جواب دیا "اس غریب پر آفت آجائے گی۔ سب اسی پر شبہ کریں گے"۔

یکایک لڑکی چلائی "او دادا! او دادا! دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں۔ دوڑو دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں"۔

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا۔ وہ اور بھی تیز ہوگئے۔ گیا نے شور مچایا۔ پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو لانے کے لیے لوٹا۔ دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقعہ مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ رستہ کا خیال نہ رہا۔ جس راہ سے یہاں آئے تھے اس کا پتہ نہ تھا۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا "معلوم ہوتا ہے راستہ بھول گئے"۔

موتی: تم بھی بے تحاشہ بھاگ نکلے۔ وہیں اسے مار گراتے۔

ہیرا: اسے مار گراتے تو دنیا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن ہم اپنا دھرم کیوں چھوڑیں؟

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے کھیت میں مٹر کھڑی تھی۔ چرنے لگے۔ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی۔ پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اسے بھی غصہ آیا۔ سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے تو ایک طرف ہٹ گیا۔

(۴)

ارے یہ کیا ہے کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے۔ ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ دونوں بیل تذبذب میں پڑ گئے۔ سانڈ پورا ہاتھی تھا۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ لیکن لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ انھیں کی طرف آرہا تھا۔ کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا: "برے پھنسے۔ جان کیسے بچے گی۔ کوئی طریقہ سوچو۔"

ہیرا نے کہا: "غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ منت سماجت کبھی نہ سنے گا۔"

موتی: بھاگ کیوں نہ چلیں؟

ہیرا: بھاگنا پست ہمتی ہے۔

موتی: تو تم یہیں مرو۔ بندہ نو دو گیارہ ہوتا ہے۔

ہیرا: اور جو دوڑائے پھر؟

موتی: کوئی طریقہ بتاؤ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آپہنچا۔

ہیرا: طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں۔ میں آگے سے دھکیلوں، تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے

لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کر دیا۔ سانڈ چاہتا تھا ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے۔ پر یہ بھی استاد تھے۔ اسے یہ موقعہ ہی نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ سانڈ جھلا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیے۔ بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اسکا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشے میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنی اشاروں کی زبان میں کہا۔ "میرا جی چاہتا تھا کہ بچہ جی کو مار ہی ڈالوں"۔

ہیرا: گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے۔

موتی: یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔

ہیرا: اب گھر کیسے پہنچیں گے یہ سوچو۔

موتی: پہلے کچھ کھا لیں تو سوچیں ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو چار ہی منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لیے آگئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈ پر پھاند کر نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اس کے سم کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا، پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا۔ دوست تکلیف میں ہے تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے تو دونوں اکٹھے ہی۔ رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

(۵)

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سارا دن گزر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں۔

کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارے دن تو دونوں دوست دروازہ کی طرف دیکھتے رہے مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو جب کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا "مجھے تو معلوم ہوتا ہے جان نکل رہی ہے"

موتی: اتنی جلدی ہمت نہ ہار دو بھائی۔ یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو۔

ہیرا: آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔

موتی: مجھ سے تو اب کچھ نہ ہو گا۔

ہیرا: بس اسی بوتے پہ اکڑتے تھے۔

موتی: ساری اکڑ نکل گئی بھیا!

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیے اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آنکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کیے اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔ موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا "آخر مار کھائی۔ کیا ملا؟"

ہیرا: زور تو آزما لیا۔

موتی: ایسا زور مارنا کس کام کا بندھن پڑ گئے۔

ہیرا: اس سے باز نہ آؤں گا خواہ بندھن بڑھتے جائیں۔

موتی: جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

ہیرا: اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ یوں بھی تو مرنا ہی ہے۔ ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اپنے بھائی یہاں بند ہیں۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے۔

موتی: ہاں یہ بات ہے۔ تو لو پھر میں بھی زور لگاتا ہوں۔

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری۔ اور ہمت بڑھی تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اس طرح زور کرنے لگا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اٹھ کھڑے ہو گئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا "تم کیوں نہیں جاتے؟"

ایک گدھے نے کہا "کہیں پھر پکڑے جائیں تو؟"

ہیرا: پکڑ لیے جاؤ تو پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقعہ ہے۔

گدھا: ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دونوں گدھے سوچ رہے تھے۔ بھاگیں یا نہ بھاگیں۔ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا "تم جاؤ، مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔"

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا "تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ ہیرا ہم اور تم دونوں اتنے دنوں ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے ہو تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔"

ہیرا: بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے۔

موتی: جس تصور کے لیے تمہارے گلے میں رسّا پڑا ہے اس کے لیے اگر مجھ پر مار

پڑے تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا۔ اور اپنے دوست کے پاس آکر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

(٦)

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا تھا۔ یہی ان کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگی بجنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آکر ان کی صورت دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا۔

سو ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں کانپ اٹھے۔ وہ کون ہے اور انھیں کیوں خریدتا ہے۔ اس کے متعلق انھیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا: "گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔"

موتی نے جواب دیا: "کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انھیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟"

ہیرا: بھگوان کے لیے ہمارا مرنا اور جینا دونوں برابر ہے۔

"چلو اچھا ہے کچھ دن اس کے پاس رہیں گے۔"

"ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے؟"

موتی : یہ آدمی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔

ہیرا : معمولی بات ہے۔ مگر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بیچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چلتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اچھلتا تھا کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا کیسی پرمسرت زندگی تھی ان کی۔ لیکن کیسے خودغرض تھے کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی کسی کو خیال نہ تھا کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجے میں گرفتار ہیں۔

معاً انھیں ایسا معلوم ہوا کہ رستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں، وہی باغ ہیں، وہی گاؤں۔ اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہو گئی۔

ارے یہ تو اپنا کھیت آگیا یہ اپنا کنواں ہے جہاں پر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا "کیا ہمارا گھر نزدیک آگیا؟"

ہیرا بولا "بھگوان کی مہربانی ہے۔"

موتی : میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔

ہیرا : یہ جانے بھی دے گا اتنا سوچ لو۔

موتی : اسے نہیں گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے گا تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے۔

ہیرا : نہیں دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور

اپنے بھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازے پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انھیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا، دوسرا اس کا پیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا "یہ بیل میرے ہیں"۔

"تمھارے کیسے ہیں؟ میں نے نیلام میں لیے ہیں"۔

جھوری: میرا خیال ہے چرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ"۔

"میرے بیل ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے۔ کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق حاصل ہے؟"

"میں نے خریدے ہیں"۔

"خریدے ہوں گے"۔

اس پر آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا اور اسے کھدیڑتا ہوا گاؤں کے باہر لے گیا اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا، گالیاں دیتا تھا، پتھر پھینکتا تھا اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا "میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو"۔

موتی: اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔

ہیرا: اب نہ آئے گا۔

موتی: آئے گا تو دور ہی سے خبر لوں گا۔

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسا، چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ بیسیوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لیے۔

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک، خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے، جہاں کوئی بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے۔ نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں، ٹٹپونجیوں سے انھیں ہمدردی ہے اور وہ انھیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا۔ چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے

ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکیٹ جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قایل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر ٹٹپونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھیں نے لیا ہے؟ آپ فرماتے ہیں، مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے۔ بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا؟ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منھ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوایا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے۔ یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں۔

جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانے بھر کے فاقہ مست، قلاش اور بے سروسامان ہیں۔ جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔ آدمی ایک بار کھوکر سیکھتا ہے، دو بار کھوکر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھوکر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے، اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمھارے وہ دوست۔ تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو۔ میں کبھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں۔ بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کرے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میرا تو ناک میں دم آگیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آمرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے، اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر مشکل سے دو چار چارپائیاں، اوڑھنا بچھونا کبھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لیے انھیں چارپائی بھی چاہیے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ا

توقفس میں بچوں کے لیے بڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت انھیں دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مردِ خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں، آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، موقع پرست ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں۔ دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرمانبردار ہے، پرلے سرے کا ایماندار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی شکل سے آدمی تھا۔ آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی

تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا کبھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز ادھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا "اگر کل سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی" سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا "دیکھتی کیا ہو۔ آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو۔ الٹی ڈانٹنے لگتی ہو" لیجیے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر میں نے سمجھا اس نالایق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو جھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بے باق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے۔ اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔

بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانہ میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا، غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امرار کے پاس ایک ایک گاڑی کپڑوں سے بھری ہوتی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دی اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے۔ وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے۔ آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو چاہتا تھا خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے، میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا، اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ

برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں مطلق عذر نہیں۔ مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے، میں جو کچھ لادوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے: بچوں کے لیے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں، قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی، مردہ دل کہوں گی، فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص، نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں، آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل آجائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسو اور پسو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے۔ پھر جب دل

میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہوجاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے بھائی بھتیجے ہیں، وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ مگر آپ برابر ان کا منھ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائیداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے، کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا "کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟" آپ نے ترش ہو کر کہا "ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ہوا۔ ابھی کیا جواب آسکتا ہے؟" ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دل جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی

تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جاتے محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقعہ نہ ملے۔ لیکن میں کیا چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمھارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع تو دس سال قبل تھا اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دو ہزار نہ ہو ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہیں تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے۔ بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز واقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے، میں ایک نہیں ہزار بنا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی، سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا، اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچر سی بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لیے تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا

قہر کہوں سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں "جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا" تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں "ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں ادھر لڑکا آ گیا۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آ گیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈھنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں "آ کر بیٹھا تو ہے جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر ہار گئی کہا گیا تھا؟ کچھ بولتا ہی نہیں"

آپ گرج پڑتے ہیں "منو ہر یہاں آؤ"

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں

مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں۔ آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصّے سے کہتے ہیں: "تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے؟"

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا، گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہوگیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں: "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے، کل نو کی خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں: "تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا۔ بچے کی روح ہی فنا ہوگئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں، ہاں آنسو ضرور پونچھ دیے۔"

آپ نے ایک نئی اینچ نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے، حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑائے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے، خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور

لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی صحت ہی کون بہت اچھی رہتی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو، لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجیے۔ برے برے شوق نہ پیدا کیجیے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیے مت۔ لگے باتیں بنانے۔ ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو وہاں بڑی بہار ہے۔ خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی۔ غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں ان پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو

ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں۔ گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا؟ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بے چاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی؟

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے۔ چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قایم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قایم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑادی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گزر گیا اور لڑکی کا سترہواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی۔ اور میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بیہودہ ہے، یہ رسم بے معنی ہے، یہاں روپے کی کیا ضرورت؟ یہاں گہنوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں، یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگادی، میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجیے۔ برات دروازے پر پڑی ہوتی ہے اور یہاں بات بات پر ردو قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات رات کے بارہ بجے تھی۔ اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں

نے بھی برت رکھا لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں ؟ اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے، جانور بھی دان دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک بڑی بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں۔ صاحب پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے، عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی ؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی۔ یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا۔ جو کچھ کرنا ہوگا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے ہوئے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر جھانکنے تک نہیں اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ برات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ بھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ن میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو ل بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر ندیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں ں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے، یہ رواجی وفاداری

بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہوگئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہوگئے ہوں اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رشتے سے ہم بے خوف آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہوسکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہوجانے کے اندیشے ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

زیور کا ڈبہ

بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ وعیدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے رہ گئے۔ اور اب گذر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی جائداد نہ چھوڑی۔ الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔ اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ، ہوادار، صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انھیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ یا ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا۔ پرکاش نے اپنے شاگرد ویرا ندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا "ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے۔ پرکاش نے دل میں سوچا۔ وہ کیا بات ہے جو ویرا ندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔ پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اما دیوی نے کہا "تمھاری کیا صلاح ہے، ویرو کا بیاہ کر دوں؟ ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔"

پرکاش نے مسکرا کر کہا "یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے۔"

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا مذبذب سے کہا "میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں، تمھاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمھیں کرنی پڑیں گی۔ یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے

تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا ہے۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے، کہیں محلہ کا بنیا گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا۔ اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا "ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپیے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں، ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں بعض پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔"

چمپا حاسدانہ لہجہ میں بولی "اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔"

چندر پرکاش: یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کھانا نہ دھمانا۔ باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں۔ ایشور بڑا غیر منصف ہے۔"

چمپا: اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور، تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روزمرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے۔ کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں، بیمار

پڑ جاتی تو جان بچتی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی "ساڑھی تمہارے لیے ضرور لاؤں گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔"

چمپا مسکرا کر بولی "چلو ایسی سن کی مٹھائی میں نہیں کھاتی، گذر ہو جائے، یہی بہت ہے۔"

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ "اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں مجھے اس کی امید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا "کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔"

"ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔"

"زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر کبھی بھدی معلوم ہوتی ہیں۔"

"ٹھاکر صاحب کبھی مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے۔ اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے لیتے جاؤ۔"

"تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے۔ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"

"میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"

"میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سود و سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔ یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک کہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فیٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا۔ کیا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے۔ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے۔ میں نلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔ پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا۔ بڑا غضب ہوگیا۔ رات کو ٹھاکر صاحب گھر میں چوری ہوگئی۔ چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا "کسی نے پکڑا نہیں چور کو؟"

"کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈبہ لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑالی اور انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی۔ باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بے چاری رو رہی تھیں۔ تمہارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مونڈی کاٹنے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا۔ یہ تو بڑا غضب ہوگیا۔ اماجی مجھے تو ابھی چمپا نے بتلایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے "کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا چور آیا کدھر سے۔"

ٹھکرائن نے رو کر کہا "میں تو لٹ گئی بھیا۔ بیاہ سر پر ہے، کیا ہوگا بھگوان۔ تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔"

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا "مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

ٹھکرائن نے مخالفت کی۔ ارے نہیں بھیا! نوکروں میں کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔"

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا "تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ مال اڑا دیا ہوگا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا "تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرلے گا۔ تم زور کوب بھی تو نہیں کر سکتے۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا۔ اب کیا ملے گا۔"

پرکاش: لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

ٹھاکر: کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں۔ نصیبوں کو روکر بیٹھے رہو اور کیا۔

پرکاش: آپ بیٹھ رہیے لیکن میں بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔

ٹھاکر: نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو، پر چور آیا باہر سے۔ تمھارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔

ٹھاکر: ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا

نہیں رہ گیا ؟

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا" میں دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پاکر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔ تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیے۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا وہاں کا چونہ لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جاکر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔

ٹھاکر صاحب نے کہا" ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا۔ مال تو جانا تھا وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔"

پرکاش : میں آج ہی گھر چھوڑ دوں گا۔

ٹھاکر : کیوں ؟ ہمیں تمہارا .....

پرکاش : آپ نہ کہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آگئی۔ میرا دروازہ تو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار روز میں پھر آگھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت ہے۔ سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے، ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر بڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔

ٹھکرائن ڈریں" تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور بھاڑ کھائے گا۔"

پرکاش: کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہوگئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا "بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو اسے کچا ہی کھا جائے۔"

"مار ہی ڈالے۔"

"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔"

"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا، کتنا ہی سمجھاؤ۔"

"کرایے کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔"

"ہم کیوں کرایہ دیں، وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں۔ ہم تو کچھ کہتے ہیں۔"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا۔"

"میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں۔"

"تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی۔"

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا "ایک سیٹھ جی کے ہاں پچاس روپیہ ماہوار کا اور کام مل گیا ہے مگر وہ روپیہ میں انھیں کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں پر خرچ ہوگی۔ اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔ خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک، صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب

پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس کی چابی کہاں تھی۔ اس کا چمپا کو پتہ نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں "کچھ نہیں، پرانی کتابیں ہیں، ماری ماری پھرتی تھیں، اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔ چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ شبہے کا انکھوا سا نکلا مگر پانی نہ پاکر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کرسکتی جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہوگئی۔ اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا۔ چمپا نے باہر سونے کے لیے کہا مگر پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے؟"

پرکاش نے غصہ میں کہا "کچھ نہیں ہیں برتن تو ہیں۔ غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔"

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا "صندوق تم نے ہٹایا تھا؟"

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی "میں کیوں ہٹانے لگی؟"

"پھر کس نے ہٹایا؟

"میں نہیں جانتی۔"

"گھر میں تم رہتی ہو جانے کون؟"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لیے بولا "طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا پکوڑیاں ہیں۔"

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ انکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بیقرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خریدلی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا، یہ کہاں سے آگئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گذرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ

ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری زیوروں کے لیے۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی۔ نہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بنک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟ پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک روز ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: "تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟"

پرکاش نے سر جھکا کر کہا: "دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں؟"

"اجی درخواست تو دو۔ اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا "آپ ضمانت داخل کر دیں گے؟"

"ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آ کر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ

بعد بولی "ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی۔ جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمھارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔"

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی۔ کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟"

چمپا نے کہا "آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا مگر ایسی خوش خبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اس کو کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا "تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟ جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔"

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا "کچھ نہیں، میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔"

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا "کیا جتنے آدمی بنک میں ملازم ہیں ان کی نیت بدلتی رہتی ہے؟"

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا "تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے۔ سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔"

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا۔ مسکرا کر بولا "اچھا تمھارا اشارہ اس طرف تھا۔ لیکن میں نے کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔"

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا "جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے اس کی آنکھ

بچا کر پانی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمھاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان چھ مہینوں میں انھوں نے تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے کچھ دیا ہی ہے۔ مکان تم نے خود چھوڑا۔ لیکن وہ بیس روپیہ ماہوار دیے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے تمھارے ہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمھارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔ تمھارا کہار ان جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے۔ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں، تمھاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو؟ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

پرکاش کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بھرا ہوا پڑا تھا۔ اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے تب ہمارے منھ سے نکل پڑتا ہے افسوس۔ چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(۷)

کئی روز گذر گئے۔ پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے
ں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویرا ندر اور اس کی نئی دلہن
بھی آئے ہوئے۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب
چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا "آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں
ا۔ چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ
نی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی
مجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہوگئے۔

بارہ بجے تھے۔ ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔
نوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا
ا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا
ر ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے
اتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا
ہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا۔ آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا
ارت سے اضطراب اور خلش سے پر۔ اب بخار کا اتار تھا سکون، فرحت اور امنگ
ے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا، آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرا ندر کا کمرہ کھولا اور اندر
ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند
اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی چوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور
طف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے

گھرے جاتے ہوتے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی، اتھاہ گہرائی میں گرا جا
ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں ا
جا رہا ہے۔ اوپر، اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا
دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویرا اندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑ
مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے: "بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری۔ زیور کا
ڈبہ مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی۔ جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ۔
کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔
ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو
نہیں کرتی۔

ٹھاکر: کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمھاری ہی کیوں۔ ویرو کی ماں تو
ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش: اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر: آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔

پرکاش: آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا تھا کسی....

ٹھاکر : کئی پنڈتوں سے ۔

پرکاش : تو بس اس کی برکت ہے ۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے جمپا کو یہ خوش خبری سنائی ۔ وہ دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی جیسے اس کا بچھڑا ہوا شوہر بہت مدت کے بعد گھر آیا ہو ۔

پرکاش نے کہا "آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے ۔"

"میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی ۔"

"تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو ۔"

"مجھے اتنی خوشی ہوتی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا ۔"

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

مس پدما

(۱)

پدما کار سے اتر کر اپنی بہن سے گلے ملی تو اسے خوشی کے بجائے روحانی صدمہ ہوا یہ وہ رتنا نہ تھی جسے اس نے سال بھر پہلے جیجا جی کے ساتھ خوش خوش گھر آتے دیکھا تھا۔ شگفتہ اور مخمور اور متبسم۔ وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ بہن کے خطوں سے پدما کو اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے اور اس کی زندگی تلخ ہو گئی لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے اس کا اسے گمان نہ تھا جیسے تصویر مٹ گئی ہو صرف اس کا خاکہ باقی ہو۔

اس نے پوچھا۔ یہ تمہاری کیا حالت ہے بہن؟ کیا تم بیمار ہو؟ اپنی بیماری کی اطلاع تم نے کبھی نہ دی۔ رتنا حسرتناک تبسم کے ساتھ بولی۔ کیا کرتی لکھ کر۔ تقدیر میں جو تھا ہوا اور آئندہ ہوگا۔ تمہیں اور ماں کو اپنی داستانِ غم سنا کر خواہ مخواہ کیوں رنجیدہ کرتی تجھ سے ملنے کو دل بہت بے قرار تھا اور تو اتنی شیطان ہے کہ بار بار آنے کا وعدہ کر کے ٹال جاتی تھی۔ ایسا غصہ آتا تھا کہ تجھے پاجاؤں تو خوب پیٹوں۔ مہینوں کا غبار جمع ہے چل کر ہاتھ دھولے۔ کچھ پی کر مضبوط ہو جا۔

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے۔ دوپہر کو اس نے صرف ایک پیالہ کھایا تھا۔ سہ پہر

ایک سنترا اور اب شام ہوگئی ہے۔ گاڑی سے اتری تو اس کا جی کچھ کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن اب جیسے بھوک غائب ہوگئی ہے۔ اب تو رتنا سے اس کے دل کی باتیں سننے کی بھوک جاگ گئی ہے۔ اس نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔ جیجا جی تو تم سے بہت محبت کرتے تھے۔ یکایک یوں برہم ہوگئے؟

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں۔ شاید میں اتنی حسین نہیں ہوں یا اتنی سلیقہ ور نہیں ہوں یا اتنی غلام نہیں ہوں یوں کہ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کا دم بھرنے والے مرد بھی نامردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی فراخ دلی کے معاوضہ میں اور بھی کامل بے زبان طاقت چاہتے ہیں۔

پدما نے حقیقت کو واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا، لیکن تم دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔

رتنا تھکی ہوئی سی بولی۔ یہی تو رونا ہے۔ ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے اور خیالات سے خوب واقف تھے۔ برسوں ہمسائے رہے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے موقع ہیں ملے بہت کم کسی کو ملتے ہوں گے۔ ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اطمینان کر لیا تھا۔ ظرف میں کہیں شگاف یا دراز تو نہیں۔ آواز اس کی بھی تھی۔ ٹھوس دھات کی آواز کی طرح ترنم۔ لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے اور سارا پانی بہہ گیا اور اب گھڑا چھوٹی تقدیر کی طرح خشک پڑا ہوا ہے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے۔ عورت کے لیے ہی کیوں مرد کے لیے بھی میں شادی کو اتنا ہی مہلک سمجھتی ہوں۔ اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہوگئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی۔ ان کی جن اداؤں اور خوش خلقیوں پر فدا تھی اب ان سے مجھے نفرت ہے۔ کیوں دل کی یہ حالت

ہے کہہ نہیں سکتی۔ لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی۔ وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بو آتی ہے۔ باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اچکن اور پاجامہ پہنتے ہیں تو میراثنوں جیسے لگتے ہیں۔ کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرنٹا ہو۔ ان کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کر کے رہتی ہوں لیکن ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں میں ان کی مرضی کی غلام ہوں۔ ان کے لیے میرے جیسی اور مجھ سے بدرجہا حسین دل بستگی کے لیے موجود ہیں، کوشاں ہیں طالب ہیں۔ میرے پاؤں میں زنجیر ہے قانون کی بھی، احساسات کی بھی اور وقار کی بھی۔ وہ آزاد ہیں اس لیے خوش ہیں، متحمل ہیں، ظاہر دار ہیں۔ میں مقید ہوں۔ میرا ایک ایک ذرہ ایک ایک نقطہ نفی ہے۔ ستم یہ ہے کہ میں ظاہر داری بھی نہیں کر سکتی۔ میں خلوص چاہتی ہوں۔ خلوص کا غصہ میں برداشت کر سکتی ہوں۔ تصنع کی دلجوئی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اور جب خلوص باقی نہیں تو خلوص دوں کہاں سے۔ تجھے میں یہی صلاح دوں گی کہ کبھی یہ بیڑی اپنے پاؤں میں نہ ڈالنا عورتوں نے شادی کو ذریعہ معاش سمجھ لیا ہے۔ میں نے بھی وہ غلطی کی۔ اپنے کو کسی پیشے کے لئے تیار نہ کیا۔ لیکن تیرے لیے ابھی بہت وسیع موقع ہے۔ تو ذہین ہے زود فہم ہے ذی حوصلہ ہے۔ تو اگر وکالت کرے تو مجھے یقین ہے تھوڑے ہی دنوں میں تیرا رنگ جم جائے۔ مرد حسن پرست ہوتے ہیں۔ حسن ان کے دل کی ازلی بھوک ہے۔ کیوں نہ ہم اس کی حماقت سے فائدہ اٹھائیں۔ جس مقدمہ میں مرد وکیل ایک پائے اس میں تو یقیں کے ساتھ دو پا سکتی ہے۔ یہ پیارا چاند سا مکھڑا کس مرد کی نظر میں نہ بس جائے گا۔ لیکن وہی شخص جو ابھی تیرے قدموں پر سر رکھتے اور تیری اداؤں پر قربان ہوگا تجھ سے شادی ہو جانے پر ستر غمزے کرے گا۔ تجھ پر رعب جتائے گا۔

بیوقوف رتنا لینا سب کچھ چاہتی تھی، دینا کچھ نہیں۔ محض اپنی نسائیت کے بوتے

پر، اپنے حسن اور انداز کے بل پر وہ حسین ہے، خوش ادا ہے، نازک اندام ہے اس لیے خلوص پانے کا حق ہے، وفا کا حق ہے، تسلیم کا حق ہے۔ کوڑیاں دے کر جواہر پارے لینا چاہتی ہے۔

مسٹر شیام ناتھ جھلائے ہوئے نظر آئے۔ پدما نے کمرے سے نکل کر ان سے ہاتھ ملایا۔

(۲)

پدما خود انھیں خیالات کی لڑکی تھی اور بہن کی تاکید نے اس کے خیالات اور بھی مستحکم کر دیے۔ بی۔ اے۔ میں تو تھی ہی۔ امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا۔ قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دو سال میں اس نے قانون بھی اول درجہ میں پاس کر لیا۔ اور وکالت شروع کر دی۔ اس کی ذہانت اور ذکاوت نے اس کے حسن کے ساتھ مل کر سال بھر تک اسے جونیر وکیلوں کی صف اول میں بٹھا دیا۔ وہ جس اجلاس میں پہنچ جاتی ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ نوجوان وکلا چاروں طرف سے آ آ کر جمیٹھ جاتے اور سائلانہ نظروں سے اسے دیکھتے۔ عدالت بھی اس کی رعنائیوں اور شیریں بیانوں سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ زہد طبیعت ججوں کی نظریں بھی مسرور ہو جاتیں۔ چہروں پر رونق آجاتی، سبھی اس کے ایک نظر کے متمنی تھے۔ اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوتی۔ وہ شکستوں سے نا آشنا تھی۔ ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا۔ اس کے موکل ملزم کو الزام ثابت ہو جانے پر بھی نرم سزا ملتی۔ یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالف کا شدید ترین مواخذہ ہوتا۔ اس کے خلاف ڈگریاں بھی ہوتیں تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا۔ شرح سود میں معقول ڈگریاں میں فریق ثانی کی شامت آجاتی۔ اس کے حسن کا جادو نامعلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہتا تھا لیکن اس کی دھاک بندھی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر جھلا پر علیحدگی کے لیے دائر کیا، میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہو گئے تھے کہ رتنا

کو اب قانون کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا علیحدگی کے لیے جن قانونی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان کا یہاں نام ونشان نہ تھا۔ لیکن پدما نے کچھ ایسی دقت نظری سے کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ جس وقت پدما اجلاس میں آکر کھڑی ہوتی اور اپنے موثر لہجہ میں خطب کمال کی روانی اور انہماک اور استدلال کی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ اپنی تقریر شروع کرتی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور آپس میں کہتے یہ قدرت کی دین ہے۔ بلاشک اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا لیکن اس میں نفسیات کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا پختہ رنگ ہوتا کہ عدالت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رتنا کی ڈگری ہوئی اور پدما کے لیے عروج کے دروازے کھل گئے۔

(۳)

دونوں بہنیں اب ایک ساتھ رہنے لگیں۔ اس شہر میں یہ خاندان ممتاز تھا۔ پدما کے والد پنڈت اٹاکول کامیاب بیرسٹر تھے۔ اور اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں دو یتیم لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرما گئے لیکن اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ بیوہ ماں کو لڑکیوں کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ رمانا تھ خود شوقین، آزاد مشرب، رنگین مزاج آدمی تھے لیکن ان کی متاہل زندگی پرسکون تھی۔ باہر وہ کچھ کریں گے گھر کے اندر ان کی بیوی کا راج تھا۔ اور وہ خوش تھی۔ بدمزگیاں ہوتیں لیکن سوال جواب تک رہ جاتیں۔ سخت زبانیوں کی نوبت نہ آتی۔ کول صاحب جابہ سپر انداختن کے اصول سے واقف تھے۔ انھیں یقین تھا وہ کتنی ہی بے عنوانیاں کریں، بیوی کی وفا، خلوص اور اعتماد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور آج ان کو مرے بیس سال ہوگئے مگر وہ دیوی ابھی تک ان کی پرستش کرتی جاتی تھی۔ وہ صرف ایک بار کھانا کھاتی اور وہ بھی بے نمک، زمین پر سوتی اور مہینے کے آدھے دن برت رکھتی، جیسے کوئی سنیاسی ہو۔ دونوں لڑکیوں کی اس روش

پر اسے روحانی کوفت ہوتی تھی۔ پر انھیں سمجھانے کی اس کے پاس عقل نہ تھی نہ ہمت۔ وہ دونوں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتیں اور اسے سادہ لوح بے زبان، فرسودہ خیال سمجھ کر اس پر رحم کرتی تھیں۔ ان میں سے کسی کو ایسا نفس پرور بے وفا، سرد مہر شوہر ملا ہوتا تو اسے ٹھوکر مار تیں اور اس کی صورت نہ دیکھتیں اور اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کجروی کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں۔ نہ جانے اماں کیوں کر ایسے وحشی، بے درد ناشناس آدمی کے ساتھ رہ سکی تھیں اور اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں۔ تعلیم نہ پانے کی یہی برکت ہے۔ وہی طوفان نوح کے زمانے کے خیالات ہیں، دنیا کتنی دور نکل گئی ہے، اس غریب کو کیا خبر۔

پدما نے وکالت شروع کرتے ہی علیحدہ مکان لے لیا تھا۔ ماں کے ساتھ اسے بہت سی قیدوں کی پابندی، شرما حضوری اس کے پاس خاطر سے کرنا پڑتی اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے روبرو جوابدہ کیوں ہو؟ وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے۔ کسی کو اس کے معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ بیوہ اسی پرانے مکان میں رہتی تھی۔ تنہا مرحوم شوہر کی یاد کی پرستش کرتی ہوئی۔ رتنا شوہر سے علیحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی۔ لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔.....

پدما نے خود ہی کوشش کر کے متصل کے ایک شہر میں ایک مدرسہ میں جگہ دلوادی۔ پدما نے تعلیم سے جو فیض اٹھایا تھا اس میں نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا۔ روح کی بالیدگی اس کے لئے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا اور فرائڈ کے نظریے اس کی زندگی کے لیے مشعلِ ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو۔ تھوڑے ہی دنوں میں دورانِ خون بند ہو جانے کے باعث بے کار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرضِ خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے محض اس لیے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا۔ نفسیات کی یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھا۔

اور وہ آزادی سے اپنی پرسنالٹی کی تکمیل کر رہی تھی۔ پیشہ کی انتہائی کشمکش ختم ہو جانے

کے بعد اب اس کی وکالت اس طرح تھی جیسے مچھلی کے لیے پانی ۔ بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے ۔ صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا۔ ان کی پیروی کے لیے کسی قسم کی تیاری یا تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ محرر ضابطے کی تکمیل کر دیتا وہ اجلاس میں ...... جا کھڑی ہوتی اور وہی ہزار بار کی دہرائی ہوتی دلیلیں اور منجھے ہوتے الفاظ ۔ اس لیے اب اسے فرصت بھی کافی تھی ۔ اس کے ہوا خواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے قرب سے محظوظ ہونے کے لیے نئے نئے مقدمات لاتے رہتے تھے۔ اور وکالت کے مندر کی وہ دیوی اور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتے رہتے تھے ۔ نوجوان ہی کیوں ، جہاں دیدہ بھی ۔ پکے ہوتے بال اور پکی ہوئی عقل والے جس پر اس کی نظر کرم ہو جاتی وہ پارس ہو جاتا ۔

مگر انسان کوشش کرنے پر بھی بالکل حیوان نہیں ہو سکتا ۔ پدما شباب کی پہلی امنگ میں تو دلوں سے کھیلتی رہی ۔ ناز و ادا ، رعنائی و دلربائی کے کرشمے اور مردانگی کی گھاتیں مگر رفتہ رفتہ اسے خرمستیوں سے نفرت سی ہونے لگی اور دل ایک وجود کی تلاش کرنے لگا جس میں درد ہو ، وفا ہو ، گہرائی ہو ، جس پر وہ تکیہ کر سکے ۔ ان شہدوں میں کبھی بھی بھونرے تھے ۔ پھول کا رس لے کر اڑ جانے والے جو اس کے رسوخ و اثر و کرم کے لیے اس کے عاشق بنے ہوئے تھے اور اب ایسا چاہنے والا چاہتی تھی جو اس کے لیے زندگی قربان کر سکے ، جو اس کی محبت کو اپنی زندگی کی آرزو بنائے اور جس پر وہ خود اپنے کو مٹا سکے ۔

اتفاق سے ایک دن مسٹر جبلا نظر آ گئے ۔ اس نے اپنی کار روک لی اور بولی "آپ تشریف لائیے ۔ رشتہ ٹوٹ جانے پر کج اخلاقی تو نہ کر سکتی تھی ۔"

جبلا نے اشتیاق سے کہا "آج ہی آیا تھا اور تم سے ملنا چاہتا تھا۔ جب سے تمھاری وہ بحث سنی ہے اور تمھارا وہ انداز دیکھا ہے تمھارا مداح ہو گیا ہوں کسی وقت تمھیں فرصت ہو تو آؤں ؟"

پدما کو ان سے ہمدردی ہوئی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ گو میں نے اپنی بہن کی حمایت میں تمھارے خلاف بہت سی غلط بیانیاں کیں، غلط الزامات لگائے لیکن وہ بیشہ کی بات تھی۔ اس میں مجھے تم سے مطلق ملال نہیں ہے۔ بولی شوق سے آیئے۔ میرے ساتھ ہی چلیے۔ میں گھر چل رہی ہوں۔

جھلا آکر بیٹھ گئے اور اس مختصر سی ملاقات میں پدما کو معلوم ہوا کہ جھلا روشن خیال اور صاف گو آدمی ہیں۔

دونوں چائے پر بیٹھے تو جھلا نے شکایت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "آپ نے تو بحث کے دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا۔"

پدما ہنس کر بولی "اس کا ذکر نہ کیجیے۔ وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔"

"تو کیا میں یہ باور کر لوں کہ آپ فی الواقع مجھے اتنا مکروہ انسان نہیں سمجھتیں؟"

"آپ کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کی رتنا سے کیوں نہ پٹی۔"

"اگر آپ انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہوگی۔"

"شادی کر کے خوش رہنے کے لیے جس بے حسی کی ضرورت ہے اتنی شاید رتنا میں نہ تھی۔"

"اب مجھے یہی تجربہ کرنا ہے۔ آزادرہ کر خوشی مل سکتی ہے یا نہیں۔ شادی کر کے دیکھ لیا۔"

"میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔"

"انسانی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں۔"

پدما نے عشوہ طراز نظروں سے دیکھا "ایسے بے دماغوں کو زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے؟"

"یہ نہ بھول جائیے کہ یہ عدالت نہیں ہے۔"

"صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے۔"

"مجھے موقع عطا کیجیے۔"

دوسرے دن جھلا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔ پدما روز بروز ان کی طرف ملتفت ہوتی جاتی تھی۔ ان میں وہ سارے اوصاف نظر آتے تھے جن کی اسے بھوک تھی۔ ان میں خیالات کی مناسبت تھی، نیک نیتی تھی، ایثار تھا، جذبات تھے اور کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ ایک دن جھلا نے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ یہیں آکر پریکٹس کروں۔ مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

پدما خوش ہو کر بولی "ضرور آجائیے۔ میری بھی یہی تمنا ہے اور اسی مکان میں ٹھہریے۔"

"یعنی آپ کے سایہ میں، غیر ممکن۔"

"مجھ سے محبت اور میرے سایہ سے نفرت۔"

"آپ کی آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔"

"یوں کہیے کہ آپ کو میری جانب سے اپنی آزادی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

"میں تو تائب ہو چکا۔"

"دل سے۔"

"تو مجھ سے معاہدہ کر لیجیے۔"

"دل سے۔"

"ہاں دل سے۔"

(۴)

رتنا نے پدما کو غصہ اور تنبیہہ سے بھرا ہوا خط لکھا۔ تو نے یہ کہاوت نہیں سنی آزمودہ را آزمودن جہل است۔ مجھے حیرت ہوتی ہے تو اس شخص کے ساتھ کیوں ملتفت ہوئی۔ شخص دغا دے گا، مکار ہے، نفسانیت سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پدما پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کو وہ خط دکھا دیا۔ جھلا بولے "تم لکھ دو۔ میں ان سے شادی نہیں کر رہی ہوں اور طلاق کی نوبت نہ آئے گی"۔ پدما نے شوخی کے ساتھ کہا "میں تو لکھ دوں گی میں ان سے شادی کر رہی ہوں اور کبھی طلاق نہ لوں گی"۔

جھلا کی ڈاکٹری پریکٹس برائے نام تھی۔ ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص تھا۔ دروازہ پر اپنا سائن بورڈ لگا دیا تھا اور صبح کو دو تین گھنٹے اپنے کمرہ میں بیٹھے ناول پڑھا کرتے تھے جس کا انھیں بے حد شوق تھا۔ مریض عنقا تھے۔ پدما ان پر ایسی فریفتہ ہو گئی تھی کہ وہ جتنا چاہیں خرچ کریں اور جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ وہ مطلق معترض نہ ہوتی۔ ان کے لیے ایک نہ ایک تحفہ روز ہی لاتی رہتی تھی۔ ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے سے بڑے رئیس کے پاس نہ ہوگی۔ ان کے لیے ایک علیحدہ کار تھی۔ دوسرے الگ، نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو۔ ذرا سی شکایت ہوئی اور تم گئے۔ روز ان کے لیے اچھی اچھی شرابیں آتیں اور پدما کو بھی شراب کا چسکا پڑ گیا تھا۔ جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے۔

اور اتنا ہی نہیں پدما جھلا کی رضا..... کی چیری تھی۔ جھلا کا نام ہی جھلا نہ تھا، مزاج کے بھی جھلے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے اور پدما ان کا منانا کرتی۔ ان کا عتاب اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ جھلا کو اپنی طاقت کا علم تھا اور اس کا اظہار کرتے تھے۔ پدما کو اپنی کمزوری کا علم نہ تھا۔ وہ اسے دلجوئی سمجھتی تھی۔ محبت میں جبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے اور صبر کرنے کی بھی بے انتہا قوت ہے۔ جھلا جبر کرتے تھے۔ پدما صبر

کرتی تھی۔ جھلا کا تبسم شکریہ کا ایک لفظ یا محض مسرت خاموش اسے باغ باغ کرنے کے لیے کافی تھی۔ سیاسیات کی طرح آئینِ محبت میں ایک حاکم ہوتا ہے دوسرا محکوم۔ محکوم پسینہ نکالتا ہے، مرتا ہے، سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا۔ حاکم سزائیں دیتا ہے۔ رعب جماتا ہے، رلاتا ہے اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت میں آجاتے تھے۔ یہ وہی پدما ہے، وہی غرور کی پتلی، وہی نازک مزاج، فسوں طراز۔ مگر کتنی متحمل ہوگئی ہے۔ اس طرح تو کوئی بوالہوس مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا۔ کوئی بوٹی سنگھادی ہے اس ڈاکٹرکے۔ دل جلے حاسد پدما پر آوازے کستے۔ پدما ہنس کر رہ جاتی۔ اس کے روندے ہوئے جو عشاق تھے انھیں اس کی زبان حلقہ بگوش دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہتے تھے جیسے کو تیسا۔

ایک دن جھلا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا۔ جھلا نے غضب ناک ہوکر پوچھا۔

"میرا خط کس نے کھولا؟"

پدما شاید اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرسکی۔

"شاید محرر کی غلطی ہوگئی۔"

"میں تمھیں اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اور تمھیں اس کا جرمانہ دینا ہوگا۔"

"حاضر ہوں سر جھکائے ہوئے۔"

جھلا نے اسے آغوش میں لے لیا۔ اور پدما پر گھڑوں نشہ چڑھ گیا۔ دنیا اس کی نظروں میں حقیر تھی۔

(۵)

دو سال گزر گئے اور پھول مرجھانے لگا۔ اس میں پھل آرہا تھا۔ نازک پدما لاغر ہوگئی۔ زرد رخسار، بے رنگ آنکھوں میں تکان، جسم میں ڈھیلاپن، فکر مغموم، اس پر ایک

ہیبت سی طاری رہتی۔ متوحش خواب دیکھتی، آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور آہ سرد کھینچ رہ جاتی۔ ساری دنیا کے رنگ روغن اور بہترین مقویات اور ممات فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے، غذا کی اشتہا غائب مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز۔ اب وہ ناز برداری چاہتی تھی۔ کوئی اسے پان کی طرح پھیرے، اسے سینے سے لگائے، کبھی علیحدہ نہ کرے۔ اپنے اوپر جو اعتماد تھا وہ رخصت ہوگیا۔ مگر جھلا اس تغیر سے بے خبر اور بے اثر اپنی روش پر چلے جا رہے تھے۔ وہی طنطنہ تھا وہی دماغ، بدما کیوں انھیں ڈنر کے لیے بلانے نہیں آئی۔ انھیں بھوک نہیں ہے۔ وہ کیوں خود پان لے کر ان کے پاس نہیں آئی۔ یہ مزاج حسن تو غائب ہوگیا۔ وہ ادائیں ہیں نہ وہ شوخی نہ وہ طاحت ور دماغ آسمان پر ہے۔ وہ چاہتے تھے بدما ظاہر کی ان پامالیوں کو مزید التفات سے پورا کرے، ان پر قربان ہو، بلائیں لے۔ اس طرح دونوں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ بدما سوچتی کتنا بے درد آدمی ہے۔ جھلا سوچتا کتنی بے اعتنائی ہے۔ اب اس سے گریز ہوتا تھا۔ ان کے لیے اب یہاں دل بستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ جانتے تھے ہی کہ بدما ان کی ڈنڈی ہے۔ پھر کیوں نہ لطف زندگی اٹھائیں کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

بدما اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہتی۔ وہ سیر کو نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے۔ وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اس نے شکایت کی "تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو تمھیں خیال بھی نہیں ہوتا مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔"

جھلا نے منہ بنایا "اچھا اب آپ کو ذرا سا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔" بے اعتنائی سے بولے "تو کیا چاہتی ہو کہ میں تمھارے آنچل سے بندھا رات دن بندھا بیٹھا رہوں۔"

"کچھ ہمدردی تو چاہتی ہوں۔"

"میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"

پدما خاموش ہو گئی۔ بدمزگی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے تئیں اب اور بھی ان کی محتاج پاتی تھی۔ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ اس خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔ رتنا کا خوف تھا۔ وہ آج بھی رقیبانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ جھلا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دے گی، اسے کتنا ذلیل کرے گی۔ وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی تو جہاں ناکام ہوئی میں وہاں کامیاب ہوں۔ تو نے جھلا کو حسن سے باندھنا چاہا ناکام ہوئی۔ میں نے انھیں اپنی محبت سے باندھا اور باوجود کسی رسمی و قانونی یا روحانی معاہدہ نہ ہونے کے اب تک باندھے ہوئے ہوں۔ وہ سب کچھ جھیل کر بھی محبت کی فتح دکھانا چاہتی اسے اپنے سے زیادہ فکر اس نظریے کی فتح کی تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی، نرس آئی، دایا آئی، جھلا کا کہیں پ نہ تھا۔ بار بار جی ڈوب جاتا۔ کرب سے بے ہوش ہو جاتی۔ روتی تھی، تڑپتی تھی۔ بدن پسی میں تر معلوم ہوتا تھا۔ جان نکل جائے گی۔ جھلا کو بار بار پوچھتی جیسے انھیں کے پاس اس درد کا علاج ہے۔ ہاں اگر وہ آکر کھڑے ہو جاتے، اس کا سر سہلاتے، اسے پیا کرتے تو وہ اس سے بھی جانگزا درد جھیل لیتی۔ لیکن وہ کہاں ہیں؟ اب تک نہیں آئے اب تو بارہ بجے ہوں گے۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا ساڑھے بارہ ہیں۔

"اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں کوئی ذرا جا کر انھیں بلا لائے۔"

"کہاں گئے، کچھ آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں مجھے معلوم نہیں مگر کسی کو بھیج دو تلاش کر لائے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا "اپنے کو اس طرح پریشان نہ کریں۔ اس سے درد بڑ ہے۔" پدما چپ ہو گئی پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو بولی "میں

بچوں گی۔ یہ درد میری جان لے کر رہے گا۔ شیام بابو آئیں گے تو کہہ دینا میں نے انھیں
معاف کیا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ بچہ آپ انھیں دے دیجیے گا اور میری
طرف سے کہنا اسے پالو۔ یہ تمھاری بدنصیب پدما کی نشانی ہے۔"

اور اسے معلوم ہوا کہ جیسے تاریک نزع کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی
آنکھیں کھلیں تو کہاں کہاں، کہاں! خوش آیند پیاری میٹھی جان بخش ضیا بار صدا کانوں
میں آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک
آئی اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل جگر تک پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو
گود میں لے لیا اور بولی "شیام بابو آگئے۔ ابھی تک نہیں آئے۔"

اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا جیسے چراغ بجھ جائے۔ زندگی کی سب سے بڑی مسرت
اس کے سامنے اور سب کچھ ناچیز تھا۔ ناز و ادا، بناؤ سنگار، بوس و کنار کہیں یہ لطف
نہیں۔ وہ اس سے محروم ہو گئی۔ وہ نوزائیدہ فرشتہ گود میں اٹھا کر آنکھوں میں غرور
اور تشکر بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اسے جھلا کی گود میں نہ دے سکی۔ اس کی آنکھوں
سے آنسو ٹپک پڑے۔

(۶)

صبح ہوئی جھلا نہیں آئے۔ شام ہوئی، رات ہوئی۔ پھر صبح ہوئی پھر شام ہوئی
یہاں تک کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں جھلا نہ آئے نہ کچھ کہہ گئے نہ کوئی خط دے گئے۔ پدما مارے
ڈر و خوف کے سوکھی جاتی تھی۔

ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا۔ کچھ روپے نکالنے تھے۔ منشی جی
بینک سے ناکام لوٹے۔ بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھلا نکال لے گئے۔ پدما نے انھیں
بینک سے لین دین کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔

اس نے تعجب سے پوچھا "مگر میرے بیس ہزار جمع تھے!"

"جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے۔"

"اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے ؟"

پدما اسی طیش سے جھلا کے کمرے میں گئی اور اس کی قد آدم تصویر کو جو ایک ہزار میں بنوائی تھی اٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ شیشہ چور ہو گیا۔ پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑا اور اسے پیروں سے خوب کچلا اور دیا سلائی لگا دی۔ پھر جھلا کے کپڑے، کتابیں، صندوق، جوتے، سگریٹ کیس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے سب کو ایک جگہ کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی اور بلند آواز میں بولی "شہدا بدمعاش، حرام خور، خر دماغ، خر نفس ـــــ اے جھلا! تم تم!"

"ہاں" ڈاکٹر جھلا جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے اور دلچسپ اور غیر فانی نظروں سے۔

پدما حیرت اور خفت اور غصہ میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہو گئی اور پوچھا "تم اب تک کہاں تھے؟ اور تم نے میرے روپے کیوں اڑا لیے؟ شہدا، بے ایمان!"

جھلا نے ظرافت آمیز انداز سے کہا "دل کا بخار اتر گیا یا باقی ہے؟"

پدما جھلا کر بولی "تم نے میرے روپے چرا لیے۔ احسان فراموش۔ میں تمھیں جیل کی سیر کرا کے ہی چھوڑوں گی۔ دغا باز!"

جھلا نے نوٹوں کا ایک بلندا اس کی طرف حقارت سے پھینک دیا اور بولے۔ "لو اپنے روپے اور میرا اسلام قبول کرو۔ یہ تھی تمھاری محبت جس کا اس شدومد سے اظہار کیا جا رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے بلڈاگ کے ساتھ کرتی ہو۔ اسے گود میں کھلاتی ہو چومتی ہو۔ ساتھ لے کر سیر کو جاتی ہو۔ اپنی بغل میں بیٹھا کر خوش ہوتی ہو۔ اسے اپنے ہاتھ سے نہلاتی ہو، ڈارلنگ اور خدا جانے کیا کیا کہتی ہو لیکن کتا ذرا دانت دکھا دے تو اس پر ہنٹروں کی بارش کر دو گی اور شاید گولی مار دو۔ میں بھی تمھارا بلڈاگ تھا۔ اتنا ہی عزیز

نا ہی حقیر۔ میں دیکھتا تھا اور امتحان لینا چاہتا تھا۔ اور اب مجھے اطمینان ہوگیا کہ یہ میرا
یال صحیح تھا۔ ایک ہفتہ تک غائب رہنا اتنا بڑا جرم نہ تھا نہ بیس ہزار روپوں کی کوئی
قیقت ہے۔

مگر تمھاری محبت دیکھ لی۔ رتنا مجھ سے علیٰحدہ ہے مگر محض قانوناً۔ اس کا مجھ سے
وحانی رشتہ ہے اور وہ ٹوٹ نہیں سکتا کیوں کہ وہ آج بھی مسز جھلا ہے اور میں جانتا
وں جس وقت میں نادم ہوکر اس کے سامنے جاؤں گا وہ پھر میری بیوی ہوگی اور میں اس کا
لام شوہر۔ تمھاری آزادی تمھیں مبارک۔ دیکھنا چاہتی ہو رتنا کے خطوط۔ یہ لو دیکھو اور
زماؤ۔ وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے اور تم کل ہاں کل کوئی دوسرا طائر پھانسو
اور پھر اس پر اپنی محبتوں کی بارش کروگی اور بدمزاج اور غصہ ور اور سخت گیر رتنا یونہی
بد سے جیتی رہے گی اور میری رہے گی۔"

بد مابت کی طرح کھڑی تھی۔ جھلا چلے جا رہے تھے جیسے قید سے چھوٹ گئے ہوں۔

نئی بیوی

(۱)

ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے۔ اس نئے خون پر زندگی قایم ہے۔ دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیاپن اس کے ایک ایک ذرے میں ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرے میں تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگامل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی از سرِ نو عود کر آئی ہے۔ جب پہلی بیوی بقیدِ حیات تھی وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے تھے۔ پھر کھانا کھا کر دکان چلے جاتے تھے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سو جاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آ جایا کرو تو بگڑ جاتے "تمھارے لیے دکان بند کر دوں یا روزگار چھوڑ دوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوش کر لیا جاتا۔ آج کل لکشمی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا ہے تب بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔" لیلا بے چاری خاموش ہو جاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے۔ لیلا کو زور کا بخار تھا۔ لالہ جی دکان پر چلنے لگے لیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا... "دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ذرا سویرے آ جانا۔"

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے "اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمہارا جی اچھا ہو جائے تو میں دکان نہ جاؤں گا۔"

لیلا رنجیدہ ہو کر بولی "میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دکان نہ جاؤ۔ میں ذرا سویرے آجانے کو کہتی ہوں۔"

"تو کیا میں دوکان پر بیٹھا موج کرتا ہوں؟"

لیلا کچھ نہ بولی۔ شوہر کی یہ بے اعتنائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ادھر کئی دن سے اس کا دل دوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس کا کیا قصور تھا۔ کس کی جوانی ہمیشہ قایم رہتی ہے۔ لازم تو یہ تھا کہ پچیس سال کی رفاقت اب ایک گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہو جاتی جو ظاہر سے بے نیاز رہتی ہے، جو عیب کو حسن دیکھنے لگتی ہے، جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں زیادہ خوش نما ہو جاتی ہے۔ لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو نہ بچے تو اس کے لیے گئو شالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان کے خیال میں لیلا کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بنی رہے۔ آرام سے کھائے پہنے اور پڑی رہے۔ اسے اختیار ہے چاہے جتنے زیور بنوائے، چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے، روزے رکھے۔ صرف ان سے دور رہے۔ فطرت انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دل جوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے خود اس کے لیے ابلہانہ سرگرمی سے متلاشی رہتے تھے۔ لیلا چالیس کی ہو کر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی۔ مگر وہ پینتالیس سال کے ہو کر ابھی جوان تھے۔ جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بیقرار لیلا سے اب انھیں ایک طرح کی کراہیت ہوتی تھی۔ اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرتناک احساس کی وجہ سے فطری کمیوں کے ازالے کے لیے کچھ رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بوالہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے۔ چہ خوش! سات لڑکوں کی تو ماں

ہوگئیں۔ بال کھچڑی ہو گئے۔ چہرہ ڈھلے ہوئے فلالین کی طرح پرشکن مگر آپ کو ابھی مہاور اور سیندور، مہندی اور ابٹن کی ہوس باقی ہے۔ عورتوں کی بھی کیا فطرت ہے، نہ جانے کیوں آرائش پر اس قدر جان دیتی ہیں۔ پوچھو اب تمھیں اور کیا چاہیے؟ کیوں نہیں دل سمجھالیتی کہ جوانی رخصت ہوگئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جاسکتا لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوئی۔ جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں دو بار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدودوں کے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔

لیلا نے انھیں شش و پنج کی حالت میں دیکھ کر مایوسانہ انداز میں کہا: "کچھ بتلا سکتے ہو کے بجے آؤ گے؟"

لالہ جی نے ملایم لہجے میں کہا "تمھاری طبیعت آج کیسی ہے؟"

لیلا کیا جواب دے۔ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے تو شاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں۔ اگر کہتی ہے اچھی ہوں تو شاید بے فکر ہو کر دو بجے رات کی خبر لائیں۔ ڈرتے ڈرتے بولی "اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ کچھ بھاری ہو رہی ہے۔ لیکن تم جاؤ دوکان پر لوگ تمھارے منتظر ہوں گے۔ مگر ایشور کے لیے ایک دو نہ بجا دینا۔ لڑکے سو جاتے ہیں۔ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ طبیعت گھبراتی ہے۔"

سیٹھ جی نے لہجے میں محبت کی چاشنی دے کر کہا: "بارہ بجے تک آجاؤں گا ضرور"

لیلا کا چہرہ اتر گیا: "دس بجے تک نہیں آسکتے؟"

"ساڑھے گیارہ سے پہلے کسی طرح نہیں۔"

"ساڑھے دس بھی نہیں۔"

"اچھا گیارہ بجے۔"

گیارہ پر مصالحت ہوگئی۔ لالہ جی وعدہ کر کے چلے گئے۔ لیکن شام کو ایک دوست

نے مجرا سننے کی دعوت دی۔ اب بچارے اس دعوت کو کیسے رد کرتے۔ جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کر دیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں۔ آپ سے کسی طرح کی دعوت کا خواستگار نہیں۔ محض دوستانہ بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہے۔ ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے کبھی کوئی بیمار ہے، کبھی مہمان آئے ہیں، کبھی پوجا ہے، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع کر لینے پڑیں گے۔ اسے شاید ہی کبھی گھر سے فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے۔ آتے ہی اپنے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر دیں لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ کی گنجائش کسی طرح نہ نکال سکے۔ دو کو ایک تو کہہ سکتے ہیں۔ گھڑی کی تیزی کے سر الزام رکھا جاتا ہے لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے آکر نوکر کو جگایا۔ کھانا کھا کر آئے تھے۔ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی، ہر لمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب سو گئی تھی۔ اسے جگانا سوتے ہوئے منے کو جگانا تھا۔

غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا۔ دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے۔ کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام لڑکیوں کے لیے پانچ وظیفے قایم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ نہیں مریں صاحب! میں مر گیا۔ زندگی کی شمع ہدایت گل ہو گئی۔ اب تو جینا اور رونا ہے۔ میں تو ایک حقیر انسان تھا۔ نہ جانے کس کار خیر کے

صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئی تھی۔ میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔" وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزلت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگامل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کرلی۔ آخر غریب کیا کرتے۔ زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہوگئی تھی۔ لکڑی کی ضرورت تو جبھی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی۔

(۲)

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہوگیا ہے۔ دوکان سے اب انھیں اس قدر انہماک نہیں ہے۔ متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت جو ان میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی اب یہ ترشح پاکر کبھی سرسبز ہوگئی ہے۔ اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ موٹر نیا آگیا ہے۔ کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کر دیے گئے ہیں۔ نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوگیا ہے۔ ریڈیو بھی لگا دیا گیا ہے۔ لالہ جی کی بوڑھی جوانی جوانوں کی جوانی سے بھی زیادہ پرجوش اور ولولہ انگیز ہو رہی ہے۔ اس طرح جیسے بجلی کی روشنی چاند کی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے۔ لالہ جی کو ان کے احباب ان کی اس جواں طبعی پر مبارکباد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز سے کہتے ہیں "بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اور ہمیشہ جوان رہیں گے۔ بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منھ پر سیاہی لگا کر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہر بدر کر دوں۔ جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے رویے کا ایمانداری سے، حسن کا آرائش سے۔ آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں۔ ارے صاحب! میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے گھنٹے سے نہ تبدیل کروں۔

معلوم ہوتا ہے زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں، کوئی شوق ہی نہیں۔ زندگی کیا ہے، گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔ یہی الفاظ وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشا دیوی کے لوح دل پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ ان سے ہمیشہ سنیما، تھیٹر، سیر دریا کے لیے اصرار کرتے ہیں لیکن آشا نہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں۔ وہ جاتی تو ہے مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آکر کہا: "چلو آج بجرے پر دریا کی سیر کر آئیں"۔

بارش کے دن تھے۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ابر کی قطاریں بین الاقوامی فوجوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں۔ سڑک پر لوگ ملار اور بارہ ماسے گاتے چلے جا رہے تھے۔ باغوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔

آشا نے بے دلی سے کہا: "میرا تو جی نہیں چاہتا"۔

لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا ....: "تمھاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی"۔

"آپ جائیں مجھے اور کئی کام کرنے ہیں"۔

"کام کرنے کو ایشور نے آدمی دے دیے ہیں۔ تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا۔ آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اٹھ جائیں گے"۔

آشا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی۔ کسی سے سُن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذت زبان رہ جاتی ہے۔ لالہ جی کے دل کی کلی کھِل گئی۔ آشا کو ان سے اس قدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کر رہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے۔ خواہ مخواہ سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا

مزہ کرکرا کر دیتی تھی۔

بولے "تمھاری بھی عجیب طبیعت ہے۔ اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو ایسا کیا طوفان آجائے گا۔ تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہو گی تو مجھے بالکل آرام طلب بنا دو گی۔ اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔"

آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا "آپ بھی تو مجھے ادھر ادھر گھما کر میرا مزاج بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ عادت پڑ جائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟"

لالہ جی نے فیاضانہ لہجے میں کہا "مجھے گھر کے دھندوں کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ بال کی نوک برابر بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھارا مزاج بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو۔ اور تم مجھے بار بار آپ کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے 'تم' کہو 'تو' کہو۔ محبت کی گالیاں دو۔ غصے کی صلواتیں سناؤ۔ لیکن تم مجھے آپ کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہو۔ میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں شریر چھوکرا بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا "اے نوج! بھلا میں آپ کو 'تم' کہوں گی۔ تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے یا بڑوں کو؟"

منیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پر ملال خبر سنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا آشا کے ان بھولے بھالے الفاظ سے ہوا۔ ان کا سارا جوش، سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جیسے برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ سر پر بانکی رکھی ہوئی رنگین پھول دار ٹوپی گلے میں پڑی ہوئی جوگیے رنگ کی ریشمی چادر۔ وہ تن زیب کا بیل دار کرتہ جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ یہ سارا ٹھاٹ جیسے انھیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ جیسے سارا نشہ کسی منتر سے اتر گیا ہو۔

دل شکستہ ہو کر بولے "تو تمھیں چلنا ہے یا نہیں؟"

"میرا جی نہیں چاہتا۔"

"تو میں بھی نہ جاؤں۔"

"میں آپ کو کب منع کرتی ہوں۔"

"پھر 'آپ' کہا۔"

آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر کہا "تم"۔ اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی طرح 'تم' کہا کرو۔ تو تم نہیں چل رہی ہو؟ اگر میں کہوں کہ تمہیں چلنا پڑے گا تب؟"

"تب چلوں گی۔ آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے۔"

لالہ جی حکم نہ دے سکے۔ فرض اور حکم جیسے الفاظ سے ان کے کانوں میں خراش سی ہونے لگی۔ کھسیانے ہو کر باہر چلے گئے۔ اس وقت آشا کو ان پر رحم آگیا۔ بولی "تو کب تک لوٹو گے؟"

"میں نہیں جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو میں بھی چلتی ہوں۔"

جس طرح کوئی ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پا کر اسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے اسی طرح لالہ جی نے رونا منہ بنا کر کہا "تمہارا جی نہیں چاہتا تو نہ چلو۔ میں مجبور نہیں کرتا۔"

"آپ ..... نہیں تم برا مان جاؤ گے۔"

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں۔ جو معمولی ساڑی پہنے ہوئے تھی وہی پہنے چل کھڑی ہوئی۔ نہ کوئی نفیس ساڑی، نہ کوئی مرصع زیور، نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجھلا اٹھتے تھے۔ شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے، جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور روشن کرنے کے لیے

اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ۔ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اس قدر خشک اور افسردہ ہے۔ جیسے کوئی ادسر کا درخت ہو۔ کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ جڑاؤں زیوروں کے بھرے صندوق رکھے ہیں۔ کہاں کہاں سے منگوائے۔ دہلی سے کلکتے سے، فرانس سے۔ کیسی کیسی بیش قیمت ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں ایک نہیں سینکڑوں مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے۔ غریب خاندان کی لڑکیوں میں یہی عیب ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔ نہ کھا سکیں نہ پہن سکیں۔ نہ دے سکیں، انھیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں!

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہیں آیا۔

(۳)

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھ لیا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے۔ لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے۔ دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں۔ گراموفون اگر بگڑ گیا ہے، گاتا نہیں یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی۔ اسے اٹھا کر رکھ دینا۔ یہ تو حماقت ہے۔

ادھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سترہ سال کا لڑکا آ گیا تھا۔ کچھ عجیب مسخرا سا۔ بالکل اجڈ اور دہقانی، کوئی بات ہی نہ سمجھتا۔ اس کے پھلکے انتیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہو جاتے بیچ میں موٹے، کنارے پتلے۔ دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے اور کبھی اتنی گاڑھی جیسے دہی۔ کبھی نمک اتنا کم کہ بالکل پھیکا، کبھی اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار۔ آشا سویرے ہی سے رسوئی پہنچ جاتی اور اس بدسلیقے مہراج

کو کھانا پکانا سکھاتی ۔" تم کتنے نالائق آدمی ہو جگل ! اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے۔ یا بھاڑ جھونکتے رہے ۔ پھلکے تک نہیں بنا سکتے ۔

جگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا ۔" بھوجی ! ابھی میری عمر ہی کیا ہے ۔ سترھواں سال ہی تو ہے ۔"

آشا ہنس پڑی ۔" تو روٹیاں پکانا کیا دس بیس سال میں آتا ہے ؟"

" آپ ایک مہینہ سکھا دیں بھوجی ۔ پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پھلکے کھلاتا ہوں کہ جی خوش ہو جائے ۔ جس دن مجھے پھلکے بنانے آ جائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لوں گا ۔"

" سالن تو اب میں کچھ کچھ پکانے لگا ہوں نہ ؟"

آشا حوصلہ افزا تبسم سے بولی ۔" سالن نہیں وہ پکانا آتا ہے ۔ ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا ۔"

" میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں ؟"

" اچھا ! تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمھارا سالن لذیذ پکے گا ؟"

" آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے ۔"

" اور میں نہیں رہتی تب ؟"

" تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے ۔"

" تمھارے دادا آ جائیں گے تو تم چلے جاؤ گے ؟"

" نہیں بھوجی ! کسی اور کام میں لگا دیجیے گا ۔ مجھے موٹر چلانا سکھوا دیجیے گا ۔ نہیں نہیں آپ ہٹ جایئے میں پتیلی اتار لوں گا ۔ ایسی اچھی ساری ہے آپ کی کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو ؟"

دور ہو ، پھوہڑ تو تم ہو ہی ۔ کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلو گے !"

جگل افسردہ ہو گیا ۔ نحیف چہرہ اور بھی خشک ہو گیا ۔

آشا نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیوں منھ کیوں لٹک گیا سرکار کا؟"

"آپ ڈانٹ دیتی ہیں بہو جی تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے سیٹھ جی کتنا ہی گھڑکیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہو جاتا ہے۔"

آشا نے تشفی دی "میں نے تمھیں ڈانٹا نہیں، صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی تمھارے پاؤں پر گر پڑے تو کیا ہو۔"

"ہاتھ تو آپ کا بھی ہے۔ کہیں آپ کے ہاتھ سے چھوٹ پڑے تب۔"

سیٹھ جی نے رسوئی کے دروازے پر آکر کہا۔ "آشا ذرا یہاں آنا۔ دیکھو تمھارے لیے کتنے خوش نما گملے لایا ہوں۔ تمھارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے۔ تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہوتی ہو۔ لونڈے سے کہہ دو کہ مہراج کو بلائے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کر لوں گا۔ مہراجوں کی کمی نہیں ہے۔ آخر کب تک کوئی رعایت کرے۔ اس گدھے کو ذرا بھی تو تمیز نہ آئی۔ سنتا ہے جگل۔ آج لکھ دے اپنے باپ کو۔" چولھے پر توا رکھا ہوا تھا۔ آشا روٹیاں بیل رہی تھی۔ جگل توے کے لیے روٹیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا وہ کیسے گملے دیکھنے جاتی۔ کہنے لگی "ابھی آتی ہوں۔ ذرا روٹی بیل رہی ہوں چھوڑ دوں گی تو جگل ٹیڑھی میڑھی بیلے گا۔"

لالہ جی نے کچھ چڑھ کر کہا۔ "اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائے گا۔"

آشا ان سنی کر کے بولی۔ "دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم چل کر بتا دو گملے کہاں رکھے جائیں؟"

"کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آتی جاتی ہوں۔"

"نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو۔"

"تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔"

لالہ جی سناٹے میں آ گئے۔ آشا نے کبھی اتنی بے التفاتی سے انھیں جواب نہ دیا تھا اور یہ محض بے التفاتی نہ تھی۔ اس میں ترشی بھی تھی۔ خفیف ہو کر چلے گئے۔ انھیں ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ان گملوں کو توڑ کر پھینک دیں اور سارے پودوں کو چولھے میں ڈال دیں۔

جگل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "آپ چلی جائیں بہو جی۔ سرکار ناراض ہوں گے۔"

"بکو مت! جلد جلد روٹیاں سینکو۔ نہیں نکال دیے جاؤ گے اور آج مجھ سے روپے لے کر اپنے لیے کپڑے بنوا لو۔ بھک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں۔ تمھیں نائی بھی نہیں جڑتا۔"

"کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیا حساب دوں گا۔"

"ارے بیوقوف! میں حساب میں نہیں دینے کی۔ مجھ سے لے جانا۔"

"آپ بنوائیں گی تو اچھے کپڑے لوں گا۔ مہین کھدر کا کرتہ، کھدر کی دھوتی، ریشمی چادر، اچھا سا چپل۔"

آشا نے مٹھاس بھرے تبسم سے کہا "اور اگر اپنے دام سے بنوانا پڑے تو؟"

"تب کپڑے بنواؤں گا ہی نہیں۔"

"بڑے چالاک ہو تم۔"

"آدمی اپنے گھر پر روکھی روٹی کھا کر سو رہتا ہے لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔"

"یہ سب میں نہیں جانتی۔ ایک گاڑھے کا کرتہ بنوالو اور ایک ٹوپی۔ حجامت کے لیے دو آنے پیسے لے لو۔"

"رہنے دیجیے۔ میں نہیں لیتا۔ اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی۔ سڑیل کپڑے ہوتے تو جی جلے گا۔"

"تم بڑے خود غرض ہو۔ مفت کپڑے لوگے اور اعلیٰ درجے کے۔"

"جب یہاں سے جانے لگوں گا تو آپ مجھے اپنی ایک تصویر دے دیجیے گا۔"

"میری تصویر لے کر کیا کرو گے؟"

"اپنی کوٹھری میں لگا دوں گا اور دیکھا کروں گا۔ بس وہی ساڑھی پہن کر کھنچوانا جو کل پہنی تھی اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو۔ مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے پاس تو بہت گہنے ہوں گے، آپ پہنتی کیوں نہیں؟"

"تو تمھیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟"

"بہت۔"

لالہ جی نے پھر آکر خفیف لہجے میں کہا۔ "ابھی تک تمھاری روٹیاں نہیں پکیں جگل۔ اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں تو میں تمھیں نکال دوں گا۔"

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جاکر گملوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آرہی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔ لالہ جی کی ساری خفت غائب ہوگئی۔ آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہورہی تھیں۔ بولی۔ "میں ان میں سے کوئی گملا نہ جانے دوں گی۔ سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا۔ سب کتنے سندر پودے ہیں۔ واہ! ان کے ہندی نام بھی بتا دینا۔"

لالہ جی نے چھیڑا۔ "سب لے کر کیا کرو گی؟ دس پانچ پسند کرلو۔ باقی باہر باغیچے میں رکھوا دوں گا۔"

"جی نہیں۔ میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی۔ یہیں رکھے جائیں گے۔"

"بڑی حریص ہو تم۔"

"حریص سہی۔ میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی۔"

"دس پانچ تو دے دو۔ اتنی محنت سے لایا ہوں"۔
"جی نہیں ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا"۔

(۴)

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑھی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آگیا۔ اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے ضرور ورنہ ان کے بار بار تقاضا کرنے پر، منت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا۔ کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی، وہ بھی بے دلی سے۔ آج ان زیوروں سے مرصع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی، اتراتی جاتی ہے۔ گویا کہتی ہے۔ دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ پہلے جو کلی تھی وہ آج کھل گئی ہے۔

لالہ صاحب پر گھڑوں نشہ چڑھا ہوا ہے، وہ چاہتے ہیں ان کے احباب واعزہ آکر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی پر لطف ہے جو انواع و اقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد، رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کر دیا ہے۔

انھوں نے تجویز کی "چلو کہیں سیر کر آئیں۔ بڑی مزے دار ہوا چل رہی ہے"۔

آشا اس وقت کیسے آسکتی ہے۔ ابھی اسے رسوئی جانا ہے۔ وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے تک فرصت ملے گی۔ پھر گھر کے کام دھندے سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اسے کہاں فرصت ہے۔ پھر کل سے اس کے کلیجے میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے۔ رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا۔ رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچ کر دل ہی دل میں پھول اٹھے۔ وہ گولیاں رنگ لا رہی ہیں۔ راج دیدنے آخر کہا تھا کہ ذرا سوچ سمجھ کر ان کا استعمال کیجیے۔ کیوں نہ ہو۔ خاندانی وید ہے۔ اس کا باپ مہاراجہ بنارس کا معالج تھا۔ پرانے مجرب نسخے ہیں اس کے پاس۔

چہرے پر سراسیمگی کا رنگ بھر کر پوچھا "تو رات ہی سے یہ درد ہو رہا ہے۔ تم نے مجھ سے کہا نہیں ورنہ ویدجی سے کوئی دوا منگا دیتا۔"

"میں نے سمجھا تھا کہ آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا مگر اب بڑھ رہا ہے۔"

"کہاں درد ہو رہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو کچھ آماس تو نہیں ہے۔"

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی ـــــ "یہی تمہاری شرارت اچھی نہیں لگتی جا کر کوئی دوا لا دو۔"

سیٹھ جی اپنی جوانمردی کا یہ ڈپلوما پا کر اس سے کہیں زیادہ محظوظ ہوئے جتنا شاید رائے بہادری کا خطاب پا کر ہوتے۔ اپنے اس کارنمایاں کی داد لیے بغیر انھیں کیسے چین ہو جاتا۔ جو لوگ ان کی شادی کے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے انھیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہنچے اور بادل دردمند بولے "میں تو بھئی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ کل سے ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ کہتی ہیں ایسا درد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔"

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ بولے "ہوا لگ گئی ہوگی اور کیا؟"

سیٹھ جی نے ان سے اختلاف کیا۔ نہیں پنڈت جی۔ ہوا کا فساد نہیں ہے۔ کوئی اندرونی شکایت ہے۔ ابھی کم سن ہیں نا! راج وید سے دوا لیے لیتا ہوں۔"

"میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔"

"آپ بات نہیں سمجھتے، یہی آپ میں نقص ہے۔"

"آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے مگر خیر۔ دوا لا کر دیجیے اور اپنے لیے بھی کوئی دوا لیتے آیئے گا۔"

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے دوست لالہ پھاگ مل کے پاس پہنچے اور

ان سے بھی قریب قریب انھیں الفاظ میں یہ پرملال خبر کہی۔ بھاگ مل بڑا شہدہ تھا مسکرا کر بولا "مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں "میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں اور تمھیں مذاق سوجھتا ہے۔ ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بھلا اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ وہ ہیں کم سن نازک اندام۔ آپ ٹھہرے آزمودہ کار، مرد میدان۔ بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈا لوں"

سیٹھ جی نے متین صورت بنائی۔ میں تو بھئی بڑی احتیاط کرتا ہوں، تمھارے سر کی قسم۔

"جی رہنے دیجیے۔ میرے سر کی قسم نہ کھائیے۔ میرے بھی بال بچے ہیں۔ گھر کا اکیلا آدمی ہوں کسی قاطع دوا کا استعمال کیجیے"

"انھیں راج وید سے کوئی دوا لے لیتا ہوں"

"اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں آپ کے پاس ہے"

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آگیا۔ شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آگئی۔ سینہ جیسے فراخ ہوگیا۔ چلتے وقت ان کا پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگا اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج ہوگئی۔ بشرے سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی۔ راج وید نے مژدۂ جاں فزا سنایا تو بولے "میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجیے گا۔ آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی۔ ذرا مہینے دو مہینے ان کا استعمال کیجیے اور پرہیز کے ساتھ رہیے۔ پھر دیکھیے ان کا اعجاز۔ اب گولیاں بہت کم رہی ہیں۔ لوٹ مچی رہتی ہے لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور وقت طلب ہے کہ ایک بار ختم ہو جانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں بوٹیاں ہیں۔ کیلاش، نیپال اور تبت سے منگانی پڑتی ہیں اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں کنٹالو ہے کے چنے چبانا ہے۔ آپ احتیاطاً ایک شیشی لیتے جائیے۔

(۵)

جگل نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کہا "بس بہوجی! آپ اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔ آج میں آپ کو چولھے کے پاس نہ آنے دوں گا۔"

آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا "کیوں آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا۔"

"آج کی بات دوسری ہے۔"

"ذرا سنوں کیا بات ہے؟"

"میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں کہو۔ میں ناراض نہ ہوں گی۔"

"آج آپ بہت سندر لگ رہی ہیں۔"

لالہ ڈنگا مل نے سینکڑوں ہی بار آشا کے حسن و انداز کی تعریف کی تھی مگر تعریف میں اسے تصنع کی بو آتی تھی۔ وہ الفاظ ان کے منہ سے کچھ اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی ہیجڑا تلوار لے کر چلے۔ جگل کے ان الفاظ میں ایک کیفیت تھی، ایک سرور تھا، ایک ہیجان تھا، ایک اضطراب تھا۔ آشا کے سارے جسم میں رعشہ آگیا۔ آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

"تم مجھے نظر لگا دو گے۔ اس طرح کیوں گھورتے ہو؟"

"جب یہاں سے چلا جاؤں گا تب آپ کی بہت یاد آئے گی۔"

"روٹی بنا کر تم کیا کرتے ہو، دکھائی نہیں دیتے؟"

"سرکار رہتے ہیں، اسی لیے نہیں آتا۔ پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے۔ دیکھیے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں۔"

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا "کون تمھیں جواب دیتا ہے؟"

"سرکار ہی تو کہتے ہیں تجھے نکال دوں گا۔"

"اپنا کام کیے جاؤ۔ کوئی نہیں نکالے گا۔ اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے۔"

"سرکار ہیں بڑے گُسّہ ور۔"

"دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کیے دیتی ہوں۔"

"آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ خبردار زبان سنبھال کر باتیں کرو۔"

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا۔ وہ روشنی کی طرح اس کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جگل نے اسی بے باکی سے کہا "میری زبان کوئی بند کرے۔ یہاں تو سب ہی کہتے ہیں۔ میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کر دے تو میں تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ یا خود زہر کھالوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں۔ پھانسی ہی تو ہوگی۔

آشا مصنوعی غصہ قایم نہ رکھ سکی جگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت ضبط کرنے پر بھی دردِ دل باہر نکل ہی آیا۔ "قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"ایسی قسمت جائے جہنم میں۔"

"تمھاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی، دیکھ لینا۔"

"تو میں بھی زہر کھالوں گا۔ دیکھ لیجیے گا۔"

"کیوں؟ بڑھیا تمھیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کرے گی تمھیں سیدھے راستے پر رکھے گی۔"

"یہ سب ماں کا کام ہے۔ بیوی جس کام کے لیے ہے اس کے لیے ہے۔"

"آخر بیوی کس کام کے لیے ہے؟"

"آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا دیتا بیوی کس کام کے لیے ہے۔"

موٹر کی آواز آئی۔ نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آگیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی "لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آجانا۔"

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو درد ناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟"

"تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب

تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا

پھنساؤ ہوگا اور کیا۔ یہاں تو ادھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"
مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"
"ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی۔"
"تو تم ہی جا کر دیکھو نا!"
"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔ اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"
"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"
"سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو ——— جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"
جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے

تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا۔ اس لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالاں کہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی سٹینی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوتے تھے مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر!"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا!"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ زمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں"

"میں پچاس کھا جاتا"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منھ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقعہ نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی

صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھسوا! روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے"۔

گھسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں"۔

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے کبھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش"۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیہ دیے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس واس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آکر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔"

"کپھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں سنّاٹے کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گوشت اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں بیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا "کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہے۔

"دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ برہمنوں کو ہزاروں کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے۔ پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کپھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا: "کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں"۔ مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔ "بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر"۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا"۔

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا"۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی"۔

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے"۔

"کہیں گے تمہارا سر"۔

"پوچھے گی تو جرور"۔

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے ہیں۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا۔ بتلاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ، کتنے تو جلو میں الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا نہ زندہ نہ گور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "پینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا: "لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی تھی وہ تو مر گئی۔ مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے

جیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "بیکنٹھ میں جائے گی دادا ۔۔۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا "مگر دادا۔ بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر!"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی۔ مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

دو بہنیں

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہے۔ کچھ اس کا رنگ کھل گیا ہے۔ مزاج میں کچھ تمکنت آگئی ہے اور بات چیت کرنے میں زیادہ مشاق ہوگئی ہے۔ بیش قیمت ساری اور بیل دار عنابی مخمل کے جمپر نے اس کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہی رام دلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑ سی ادھر ادھر کھیلا کرتی تھی۔ آخری بار روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا، دو سال قبل۔ تب بھی اس کی شکل و صورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا۔ لمبی تو ہوگئی تھی مگر تھی اتنی ہی دبلی، اتنی ہی زرد رو، اتنی ہی بدتمیز۔ ذرا ذرا سی بات پر رو ٹھنے والی۔ مگر آج تو حالت ہی کچھ اور تھی جیسے کلی کھل گئی ہو اور حسن اس نے کہاں چھپا رکھا تھا۔ نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے حسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے۔ ریشم اور مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا۔ پھر بھی وہ آنکھیں آنکھوں میں سمائی جاتی ہیں۔ پچاسوں عورتیں جمع ہیں مگر یہ سحر کشش اور کسی میں نہیں اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دہک اٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو وہ اپنی صورت بھی دیکھتی۔ گھر سے چلتے وقت اس نے اپنی صورت دیکھی تھی۔ اسے چمکانے کے لیے جتنا صیقل کر سکتی تھی، کیا تھا لیکن اب وہ صورت، جیسے

یادداشت مٹ گئی ہے۔ اس کی ایک دھندلی سی پرچھائیں ذہن میں ہے۔ اسے وہ پھر سے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔ یوں تو اس کے پاس میک اپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگار کرنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں۔ یہاں کوئی آئینہ تو ہوگا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہوگا۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی اور قدآدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے خدوخال بے عیب ہیں۔ گو وہ تازگی وہ شگفتگی وہ نظر فریبی نہیں ہے۔ ہاں نہیں ہے۔ رام دلاری آج کھلی ہے۔ اسے کھلے زمانہ ہوگیا لیکن اس خیال سے اسے تسکین نہیں ہوئی۔ وہ رام دلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی۔ یہ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ کسی میں اصل حسن کی پرکھ نہیں۔ انھیں نوجوانی اور شوخی اور نفاست چاہیے۔ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں۔ میرے کپڑوں میں رام دلاری کو کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو یہ سارا جادو کہاں اڑ جاتا ہے۔ چڑیل سی نظر آئے۔ ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے۔ شادی میں جو جوڑے اور زیور آئے تھے وہ بہت دل شکن تھے۔ امارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا۔ اس کے سسر ایک ریاست میں مختار تھے اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا۔ اس دو سال میں کیسے بن برس گیا۔ کون جانے زیور کسی سے مانگ لائی ہو۔ کپڑے بھی دو چار دن کے لیے مانگ لیے ہوں۔ اے یہ سوانگ مبارک رہے۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔ اپنی حیثیت کو بڑھا کر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے۔ گھر میں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ہے لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے، بزاز کے اور درزی کے تقاضے سہیں گی۔ شوہر کی گھڑکیاں کھائیں گی، روئیں گی، روٹھیں گی مگر نمائش کے جنون کو نہیں روک سکتیں۔ گھر والے بھی سوچتے ہوں گے کتنی پھوہڑ طبیعت ہے اس کی۔ مگر یہاں تو بے وفائی پر کمر باندھ لی، کوئی کتنا ہی ہنسے بے حیا کی بلا دور۔ بس یہی دھن سوار ہے کہ جدھر سے نکل جائیں ادھر اس

کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لیے ہیں بے شرم جو ہے۔

اس کے چہرے پر غرور کی سرخی جھلک پڑی۔

نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے۔ کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں۔ بھگوان انھیں زندہ اور سلامت رکھے۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ خود اچھا پہننے اور کھا لینے سے ہی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے گھر والے غریب ہیں، پر عزت تو ہے۔ کسی کا گلا تو نہیں دباتے، کسی کی بددعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کر کے وہ پھر برآمدے میں آئی تو رام دلاری نے جیسے رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "جیجا جی کی کچھ ترقی ورقی ہوئی کہ نہیں بہن یا ابھی تک وہی پچھتر روپے پر قلم گھس رہے ہیں۔ روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اغوہ رے دماغ، گویا اس کا شوہر لاٹ ہی تو ہے۔ اکڑ کر بولی "ترقی کیوں نہیں ہوئی۔ اب تو کے گریڈ میں ہیں۔ آج کل یہ بھی غنیمت ہے۔ میں تو اچھے اچھے ایم۔ اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی پوچھتا نہیں۔ تیرا شوہر اب بی۔ اے۔ میں ہوگا"

"انھوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا بہن۔ پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا اور کیا۔ ایک کمپنی کے ایجنٹ ہو گئے ہیں۔ اب ڈھائی سو روپے ماہوار پاتے ہیں، کمیشن اوپر سے۔ پانچ روپے روز سفر خرچ کے بھی ملتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ پانچ سو کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے بہن۔ اونچے عہدے پر ہیں تو اچھی حیثیت بھی بنائے رکھنی لازم ہے۔ ساڑھے تین سو روپے بے داغ گھر دے دیتے ہیں۔ اس میں سو روپے مجھے ملتے ہیں، ڈھائی سو روپے میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے۔ ایم۔ اے۔ پاس کر کے کیا کرتے"

روپ کماری اسے شیخ چلی کی داستان سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی۔ مگر رام دلاری کے لہجے میں اتنی صداقت ہے کہ تحت الشعور میں وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے اور

اس کے چہرے پر خفت اور شکست کی بدمزگی صاف جھلک رہی ہے۔ مگر اسے اپنے ہوش و حواس کو قایم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے مٹا دینا پڑے گا۔ اسے جرحوں سے اپنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی سے زیادہ حقیقت نہیں۔ وہاں تک وہ برداشت کرے گی۔ اس سے زیادہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ کہیں یہ روداد سچ نکلی تو وہ کیسے رام دلاری کو منہ دکھائے گی۔ اسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ کہاں پچیس اور کہاں پانچ سو۔ اتنی بڑی رقم اگر غیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے۔ پانچ سو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا "جب ایجنٹی میں اتنی تنخواہ اور بھتے ملتے ہیں تو کالج بند کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں"

رام دلاری بہن کی خفت کا مزہ اٹھاتی ہوئی بولی "بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو۔ ایم۔ اے۔ تو سب ہی پاس ہو سکتے ہیں مگر ایجنٹی کرنی کس کو آتی ہے۔ یہ خداداد ملکہ ہے۔ کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اچھا ایجنٹ ہو جائے۔ روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز ہے۔ اپنے مال کی خوبی کا یقین پیدا کرنا، یہ ذہن نشین کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیرپا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی آسان کام نہیں ہے۔ ایک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کا تالیف قلب کرنی پڑتی ہے اور دوں کی تو ان راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے۔ شروع شروع میں انھیں بھی جھجک ہوئی تھی۔ مگر اب تو اس دریا کے مگرمچھ ہیں۔ اگلے سال ترقی ہونے والی ہے"

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوتی جا رہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ بے رحم زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری

جو حسین ہے، تمیز دار ہے، کفایت شعار ہے۔ اپنے شوہر پر جان دیتی ہے۔ بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اس کی زندگی اس خستہ حالی میں بسر ہو اور یہ بدتمیز، تن پرور، چنچل چھوکری رانی بن جائے۔ مگر اب کچھ امید باقی تھی۔ شاید اس کی تسکین قلب کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اسی تمسخر کے انداز سے بولی "تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں گے"

"ایک ہزار تو نہیں مگر چھ سو میں شبہ نہیں"

"کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہوگا"

"بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے۔ جب تم انھیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں چھ سو ملیں۔ جو ساری دنیا کو چرائے، اسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا"

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر روپ کماری نے تحقیر شروع کی "میں تو اس کو بہت معزز پیشہ نہیں سمجھتی۔ سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو۔ یہ تو ٹھگ بدیا ہے"

رام دلاری زور سے ہنسی۔ روپ کماری پر اس نے کامل فتح پائی تھی "اس طرح تو جتنے وکیل بیرسٹر ہیں سب ہی ٹھگ بدیا کرتے ہیں۔ اپنے موکل کے فائدے کے لیے انھیں اپنی بھاؤں کا صدر بناتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں۔ ان پر پھولوں کی اور زر و جواہر کی برکھا کرتے ہیں۔ آج کل دنیا پیسہ دیکھتی ہے۔ پیسے کیسے آئے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ جو بدنصیب ہیں، ناقابل ہیں، پست ہمت ہیں ضمیر اور اخلاق کی دہائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے۔

روپ کماری خاموش ہوگئی۔ اب اسے یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دلاری اس سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ اس سے سفر نہیں۔ تمسخر یا تحقیر سے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ اسے کسی بہانے سے رام دلاری کے گھر جا کر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی۔ اگر رام دلاری واقعی لکشمی کا

بردان پا گئی ہے تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھے گی کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے۔ کہیں ایمانداری کی قدر نہیں ہے۔

مگر کیا سچ مچ اس خیال سے اسے تسکین ہوگی۔ یہاں کون ایماندار ہے۔ وہی جسے بے ایمانی کا موقع نہیں ہے۔ اور اتنی ہمت ہے کہ وہ موقع پیدا کرے۔ اس کے شوہر کچھ تو روپے ماہوار پاتے ہیں۔ کیا دس بیس روپے اوپر سے مل جائیں تو وہ خوش ہو کر لے نہ لیں گے۔ ان کی ایمانداری اور اصول پروری اس وقت تک ہے جب تک موقع نہیں ملتا۔ جس دن موقع ملا ساری اصول پروری دھری رہ جائے گی اور تب کیا روپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ناجائز آمدنی سے روک دے۔ روکنا تو درکنار وہ خوش ہوگی۔ شاید اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے۔ ابھی ان کے دفتر سے واپسی کے وقت میں مارے بیٹھی رہتی ہے۔ تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی اور جونہی وہ گھر میں آئیں گے ان کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ رام دلاری امنگ کے ساتھ گا رہی تھی اور روپ کماری وہیں برآمدے میں اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی ناچے، اسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بدنصیب ہے، رونے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کو مہمان رخصت ہونے لگے۔ روپ کماری بھی اٹھی۔ یکہ منگوانے جا رہی تھی کہ رام دلاری نے کہا "یکہ منگوا کر کیا کرو گی بہن۔ مجھے لینے کے لیے ابھی کار آتی ہوگی۔ دو چار دن میرے یہاں رہو، پھر چلی جانا۔ میں جیجا جی کو کہلا بھیجوں گی۔"

روپ کماری کا آخری حربہ بھی بے کار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر دریافت حال کی خواہش یکایک فنا ہو گئی۔ وہ اب اپنے گھر جائے گی اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی۔ ان پھٹے حالوں کیوں کسی کے گھر جائے بولی "بہن میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب آؤ گی؟ میں سواری بھیج دوں گی۔"

"میں خود کہلا بھیجوں گی۔"

"تمھیں یاد نہ رہے گا۔ سال بھر ہو گیا۔ بھول کر بھی یاد نہ کیا۔ میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ پھر بھی اتنی دور کہ سال سال بھر گزر جائے اور ملاقات نہ ہو۔"

گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں مگر موقع ہی نہ ملا۔ اتنے میں رام دلاری کے شوہر مسٹر گروسیوک نے آکر بڑی سالی کو سلام کیا۔ بالکل انگریزی وضع تھی۔ کلائی پر سونے کی گھڑی۔ آنکھوں پر سنہری عینک۔ بالکل اپٹوڈیٹ۔ جیسے کوئی تازہ وارد سویلین ہو۔ چہرے سے ذہانت، متانت اور شرافت برس رہی تھی۔ وہ اتنا خوبرو اور جامہ زیب ہے، روپ کماری کو کبھی گمان بھی نہ تھا۔ دعا دے کر بولی "آج یہاں نہ آتی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی۔"

گروسیوک ہنس کر بولا "بجا فرماتی ہیں۔ الٹی شکایت۔ کبھی آپ نے بلایا اور میں نہ گیا۔"

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھتے ہو۔ وہ بھی تمھارا ہی گھر ہے۔"

"اب مان گیا بھابی صاحب! بے شک میری غلطی ہے۔ انشاءاللہ اس کی تلافی کروں گا۔ مگر آج ہمارے گھر رہیے۔"

"نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے۔ پھر آؤں گی۔ لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے۔"

رام دلاری بولی "میں کتنا کہہ کے ہار گئی بولتی ہی نہیں۔"

دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گروسیوک کار ڈرائیو کرتا ہوا چلا۔ ذرا دیر میں اس کا مکان آگیا۔ رام دلاری نے پھر روپ کماری سے چلنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر وہ نہ مانی "لڑکے گھبرا رہے ہوں گے۔" آخر رام دلاری اس سے مل کر اندر چلی گئی۔ گروسیوک نے کار بڑھائی۔ روپ کماری نے اڑتی ہوئی نگاہ سے رام دلاری کا مکان دیکھا اور ٹھوس

حقیقت سلاخ کی طرح اس کے جگر میں چبھ گئی۔ کچھ دور چل کر گردسیوک بولا "بھابی میں نے اپنے لیے کیسا اچھا راستہ نکال لیا۔ اگر دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا۔"

روپ کماری نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "رام دلاری نے مجھ سے کہا" بھگوان کرے جہاں رہو خوش رہو۔ ذرا ہاتھ پیر سنبھال کر رہنا۔"

"مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ دولت کا مزہ جب ہے کہ ایمان سلامت رہے۔ ایمان کھو کے پیسے ملے تو کیا۔ میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور آنکھ کس کی بچاؤں۔ سب سیاہ و سفید تو میرے ہاتھ میں ہے۔ مالک تو کوئی ہے نہیں۔ اس کی بیوہ ہے۔ اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے اس کا کاروبار نہ سنبھال لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا۔ میرے سامنے تو مالک صرف تین مہینے زندہ رہے۔ مگر بڑا مردم شناس آدمی تھا۔ مجھے سو روپے پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں ڈھائی سو کر دیے۔ آپ کی دعا سے پہلے ہی مہینے میں میں نے بارہ ہزار کا کام کیا۔"

"کام کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"وہی مشینوں کی ایجنٹی طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا۔"

روپ کماری کا منحوس گھر آ گیا۔ دروازے پر ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے شوہر بابو رمانا تھ دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ روپ کماری اتری مگر اس نے گردسیوک سے آنے کے لیے اصرار نہ کیا۔ بے دلی سے کہا ضرور، مگر زور نہ دیا۔ اور رمانا تھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

روپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے پھوٹا ہوا نصیب ہو نہ کہیں فرش، نہ فرنیچر، نہ گملے۔ دو چار ٹوٹی ٹاٹی کرسیاں۔ ایک لنگڑا میز، چار پانچ پرانی دھرانی کھاٹیں یہی اس گھر کی بساط تھی۔ آج صبح تک روپ کماری اس گھر میں خوش تھی لیکن اب اس گھر سے اسے مطلق دلچسپی نہ رہی۔ لڑکے اماں اماں کر کے دوڑے مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا۔ سر میں درد ہے، وہ کسی سے نہ بولے گی۔ اب بھلا کھانا پکاتا کون؟ لڑکوں نے تو دودھ پی

لیا ہے مگر رمانا تھ نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے تو پکائے۔ مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے۔ مجبوراً بازار سے پوریاں لانی پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے؟ میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔ اور جو رات بھر میں وہیں رہ جاتی ہے آخر تم ایک مہراجن کیوں نہیں رکھ لیتے یا زندگی بھر مجھی کو پیستے رہو گے۔

رمانا تھ نے اس کی طرف مظلوم اور پرسوال حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ روپ کماری سے انھوں نے ہمیشہ بے عذر اطاعت پائی ہے۔ بے عذر ہی نہیں خوش دلانہ بھی۔ انھوں نے کئی بار مہراجن رکھ لینے کی تجویز اور خواہش کی تھی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی۔ چار پانچ روپیہ کا خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ رقم بچ رہے گی تو بچوں کے لیے مکھن آجائے گا اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے جیسے غصہ میں بھری ہو۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے "مہراجن رکھنے کے لیے میں نے تم سے کئی بار کہا۔"

"تو لا کیوں نہ دیا۔ میں اسے نکال دیتی تو کہتے۔"

"ہاں یہ غلطی ہوئی۔"

"ہاں یہ غلطی ہوئی۔"

"تم نے کبھی سچے دل سے کہا۔ محض مہراجن کے لیے کہا۔ تمہارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں۔ تم خوش تھے کہ اچھی لونڈی مل گئی۔ ایک روٹی کھاتی ہے اور چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ اتنی سستی لونڈی اور کہاں ملتی۔ محض کپڑے اور کھانے پہ، وہ بھی جب مگر بھر کی ضرورتوں سے بچے تو بچھتر روپلیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہو اور ساری دنیا کا خرچ۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے کتنی کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں

تمھارے ساتھ زندگی خراب ہوگئی ۔ وہ مرد بھی ہوتے ہیں جو بیویوں کے لیے آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں ۔ گردسیوک ہی کو دیکھو۔ تم سے کم پڑھا ہے ۔ عمر میں تم سے کہیں کم ہے۔ مگر پانچ سو روپیہ مہینہ لاتا ہے ۔ رام دلاری رانی بنی بیٹھی رہتی ہے ۔ تمھارے لیے یہ ہی بکھیڑ بہت ہیں ۔ رانڈ مانڈ میں ہی خوش ۔ تمھیں تو عورت ہونا چاہیے تھا۔ اوروں کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں ۔ مگر میں تو تمھارے لیے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں ، تمھیں تو کوئی تکلیف ہوتی نہیں ، تمھیں تو کپڑے بھی اچھے چاہئیں ، کھانا بھی اچھا چاہیے ۔ کیونکہ تم مرد ہو ، کما کر لاتے ہو ۔ میں چاہے جیسے رہوں ، تمھاری بلا سے ...!"

یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا اور بچارے رماناتھ خاموش سنتے رہے ۔ اپنی دانست میں انھوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا ۔ ان کی تنخواہ کم ہے ضرور ۔ یہ ان کے بس کی بات تو نہیں ۔ وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے ہیں ۔ افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں ۔ اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینے تک بلاناغہ پڑھایا ۔ اسی لیے کہ وہ خوش رہیں ۔ اب اور کیا کریں ۔ روپ کماری کی برہمی کا راز تو انھیں معلوم ہو گیا ۔ اگر گردسیوک واقعی پانچ سو روپیہ لاتا ہے تو بے شک خوش نصیب ہے لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا ۔ اسے ایسا موقعہ مل گیا ۔ دوسروں کو ایسے مواقع کہاں ملتے ہیں ۔ وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی اسے پانچ سو ملتے ہیں یا محض گپ ہے اور بالفرض ملتے ہوں تو اس سے کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ وہ انھیں نشانہ ملامت بنائے اور اگر اسی طرح وہ روپ کماری سے زیادہ حسین زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اسے کوسنا شروع کر دیں تو کیسا ہو ۔ روپ کماری حسین ہے ، شیریں زبان ہے ، خوش مذاق ہے بے شک لیکن اس سے زیادہ حسین ، زیادہ شیریں ، زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے ۔ ایک زمانہ تھا جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی ۔ لیکن وہ جنون اب باقی نہ رہا ۔ جذبات کی

دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے۔ انھیں ایک مدت گذر گئی۔ اب تو انھیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر معلوم ہو گئے ہیں۔ صابر و شاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے۔ روپ کماری اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انھیں روپ کماری سے ہمدردی ہوتی۔ اس کی سخت کلامیوں کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شربت کی طرح پی گئے۔ اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے روپ کماری کے دل میں ایسے دل شکن، مایوس کن، غیر منصفانہ خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ وہ کوئی فلاسفر نہیں، تارک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنے طبعی سکون کو قائم رکھے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر رمانا تھ دریافت حال کی مہم کے لیے آمادہ ہو گئے۔

(۲)

ایک ہفتہ تک روپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی۔ بات بات پر جھنجھلاتی لڑکوں کو ڈانٹتی، شوہر کو کوستی، اپنی تقدیر کو روتی۔ گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا ورنہ نئی آفت آجاتی۔ لیکن اب کسی کام سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ گھر کی جن پرانی دھرانی چیزوں سے اسے دلی تعلق ہو گیا تھا۔ جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی تھی، ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گھر میں ایک ہی خدمت گار تھا۔ اس نے جب دیکھا بہو جی گھر کی طرف سے خود ہی لاپروا ہیں تو اسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا۔ دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے اور رمانا تھ تو اس کے سائے سے بھاگتے تھے۔ جو کچھ سامنے آجاتا زہر مار کر لیتے اور دفتر چلے جاتے۔ دفتر سے لوٹ کر دونوں بچوں کو ساتھ لے لیتے اور کہیں گھومنے نکل جاتے۔ روپ کماری سے کچھ بولتے روح فنا ہوتی تھی۔ ہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن رمانا تھ دفتر سے لوٹے۔ ان کے ساتھ گرو سیوک بھی تھے۔ روپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانے سے مصالحت کر لی تھی اور اس وقت جھاڑن لے کر کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گرو سیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا۔ روپ کماری دل

میں کٹ گئی۔ رمانا تھ پر بے حد غصہ آیا۔ انھیں لاکر یہاں کیوں کھڑا کر دیا۔ نہ کہنا نہ سننا۔ بس بلا لائے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر گر وسیوک نے کیا سمجھا ہوگا۔ مگر انھیں عقل آئی کب تھی۔ وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے اور آپ اسے کھوتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی شرم نہیں۔ جیسے بے حیائی کا جامہ پہن لیا ہے۔ خواہ مخواہ اسے ذلیل کرتے ہیں۔

دعا دے کر عافیت پوچھی اور کرسی رکھ دی۔ گر وسیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ آج بھابی صاحبہ نے میری دعوت کی ہے۔ میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا لیکن انھوں نے کہا کہ تمہاری بھابی کا سخت تقاضہ ہے۔ تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔

روپ کماری نے بات بنائی "تم سے اس دن روادری میں ملاقات ہوئی دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا"

گر وسیوک نے در و دیوار پر نظر ڈال کر کہا "اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی"

روپ کماری کو اب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بد مذاق ہے۔ دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پروا نہیں۔ یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں کہیں ایک ایسا ہی بھگوان نکلتا ہے کسی قدر ترش ہو کر بولی "پنجرے میں رہنا کنگھرے میں رہنے سے اچھا ہے۔ پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں۔ کنگھر درندوں کا مسکن ہے۔ گر وسیوک کنایہ نہ سمجھ سکا۔ بولا "مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے، دم گھٹ جائے۔ میں آپ کے لیے اپنے گھر کے پاس ایک گھر لے کر دوں گا۔ خوب لمبا چوڑا۔ آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائے گا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے۔ میں تو اسی کے مکان میں رہتا ہوں سینکڑوں مکان ہیں اس کے پاس۔ سینکڑوں۔ سب میرے اختیار میں ہیں۔ جس کو جو مکان چاہے دے دوں۔ میرے اختیار میں ہے کرایہ لوں نہ لوں۔ میں آپ کے لیے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا جو سب سے اچھا ہے۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں"۔

روپ کماری سمجھ گئی حضرت اس وقت نشے میں ہیں جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رخسار کچھ پھول گئے ہیں۔ زبان میں ہلکی سی لغزش تھی جو ہر لمحہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ ایک

جوان، خوبصورت، شریف چہرہ، رکیک اور بے غیرت بن گیا تھا جسے دیکھ کر نفرت ہوتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا" میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں۔ آپ کے لیے میری جان حاضر ہے۔ آپ کے لیے مکان کا انتظام کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں مسز لوہیا کا مختار ہوں۔ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ میں اس کی ساری جائداد کا مالک ہوں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپے کا نوکر رکھا تھا۔ بڑا مالدار آدمی تھا۔ مگر کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی دولت کہاں سے آتی تھی، کسی کو معلوم نہیں۔ میرے سوا کوئی جانتا نہیں وہ خفیہ فروش تھا کسی سے کہتا نہیں وہ خفیہ فروش تھا کوکین بیچتا تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی۔ اس کی موت کے بعد میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں۔ ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں مجال نہیں کہ کوئی مجھے گرفتار کرے۔ بڑے بڑے افسروں سے میرا یارانہ ہے۔ ان کے منہ میں نوٹوں کے بلندے ٹھونس ٹھونس کر ان کی آواز بند کر دیتا ہوں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ حساب میں لکھتا ہوں۔ ایک ہزار دیتا ہوں، پانچ سو باقی یاروں کا ہے۔ بے دریغ روپے آتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتا ہوں۔ بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے۔ سادھو سنتوں کی سیوا میں لگی رہتی ہے۔ اور بندہ چین کرتا ہے۔ جتنا چاہوں خرچ کروں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی بولنے والا نہیں" جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر" یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے۔ مجھے دعا دیجیے۔ جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انھیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انھیں پکڑتی ہے جو اس کے لیے اپنا دین و ایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے برا نہ کہیے۔ جتنے دولت مند ہیں سب لٹیرے ہیں۔ میں بھی انھیں میں ایک ہوں۔ کل میرے پاس روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم شالہ بنوا دوں۔ پھر دیکھیے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے مجھے یہ دولت کہاں سے ملی۔ ایک وکیل

ایک گھنٹہ بھر بحث کرکے ایک ہزار سیدھا کر لیتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچ سو روپے مار لیتا ہے۔ اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ مار کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے۔ میں بھی وہی کرتا ہوں جو دوسرے کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ہے عیش کرنا۔ میں بھی لوٹوں گا اور عیش کروں گا۔ عیش کروں گا اور خیرات کروں گا اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کتنے گنوا دوں، یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑپتی ہو گئے۔ کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑپتی ہو گئے۔"

رمانا تھ نے آکر کہا "گردسیوک کیا کر رہے ہو۔ چلو چائے پی لو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

گردسیوک اٹھا بیر لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر اٹھا اور جھومتا جھامتا ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا۔ روپ کماری نے آزادی کا سانس لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کمرے کی ہوا جیسے بھاری ہو گئی تھی۔ جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دل آویز روپ بھر کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج اسے ان کی اصلی بھدی، گھناؤنی صورت نظر آئی۔ جس سادگی اور خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گزاری تھی اس پر حرامکاری اور آبلہ آفرینی کا گزر نہ تھا۔ ان داموں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارا عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلہ نہ کرے گی۔ وہ اپنے حال میں خوش ہے۔ رام دلاری پر اسے رحم آیا۔ جو نمود و نمائش کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے۔ مگر ایک لمحہ میں گردسیوک کا دل نرم پڑ گیا۔ جس سوسائٹی میں دولت بجتی ہے، جہاں انسان کی قیمت اس کے بنک اکاؤنٹ اور شان و شوکت سے آنکی جاتی ہے۔ جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان میں حسد اور غضب اور فرومائیگی کے جذبات کو اکساتا رہتا ہے وہاں گردسیوک اگر رو میں بہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت رمانا تھ نے آکر کہا "یہاں بیٹھا بیٹھا کیا بک رہا تھا؟ میں نے تو اسے

رخصت کر دیا۔ جی ڈرتا تھا کہیں اس کے پیچھے پولیس لگی ہو۔ کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا جاؤں
روپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا "وہی اپنی خفیہ فروشی کا ذکر کر رہا تھا۔"

"مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا۔ شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے۔"

"جی نہیں! آپ اپنی کلرکی کیے جائیے۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے۔"

"مگر کلرکی میں عیش کہاں؟ کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں"

"مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی۔"

"تم سے آکر یہ قصہ کہتا تو تمھیں یقین نہ آتا۔"

"ہاں یقین تو نہ آتا۔ میں تو قیاس ہی نہیں کر سکتی کہ اپنے فائدے کے لیے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے۔"

"مجھے سارا قصہ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے خوب شراب پلا دی تھی کہ نشہ میں بہکے گا ضرور۔ سب کچھ خود قبول جائے گا۔"

"واللہ تمھاری طبیعت بھی"

"ہاں ٹلائی تو ہے۔ مگر عیب کرنے کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا!"

"ایشور نہ کرے وہ ہنر تم میں آئے۔ مجھے اس بچارے پر ترس آتا ہے۔ معلوم نہیں راستہ میں اس پر کیا گزری؟"

"نہیں وہ تو اپنی کار پر تھے۔"

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی "تم مجھے دلاری کے گھر پہنچا دو۔ ابھی شاید میں اس کی مدد کر سکوں۔ جس باغ کی وہ سیر کر رہی ہے اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید میں اسے بچا سکوں۔"